معارف

جنوری ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰؍روپے۔ فی شمارہ ۲۵؍روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴؍روپے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰؍روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰؍روپے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰؍روپے میں دستیاب۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Office Mobile) 09170060782

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری رمنیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۵ ماہ جمادی الاول ۱۴۴۱ھ مطابق ماہ جنوری ۲۰۲۰ء عدد ۱

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

بی۔جے۔پی جب چند مہینے پہلے دوبارہ منتخب ہوکر اقتدار میں آئی تو اگلے پانچ سال میں جو مقاصد ان کو حاصل کرنے تھے اور اس کے لیے جو لائحہ عمل اختیار کرنا تھا وہ ان کے ذہن میں پوری طرح واضح تھا اور ان کو اس کے حصول کی جلدی بھی تھی۔ جس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک صدی سے کوشش کی جا رہی تھی وہ سامنے نظر آ رہی ہو تو مزاج میں کچھ عجلت آجائے تو چنداں تعجب کی بات نہیں۔ آر۔ایس۔ایس اور اس سے پہلے ساورکر اور اب بی۔جے۔پی کی ساری تگ و دو کا مقصد و محور ہندوستان میں ہندو راشٹر کا قیام تھا اور اس کے لیے گذشتہ پانچ برسوں میں انہوں نے بڑی حد تک زمین بھی تیار کرلی تھی۔ تقریباً تمام جمہوری ادارے جن پر ہندوستان کے تکثیری اور سیکولر سماج کی اساس قائم تھی ایک ایک کرکے پہلے ہی سرنگوں ہو چکے تھے۔ میڈیا کو کنٹرول کرنے کی مہم بڑی حد تک کامیابی سے ہم کنار ہو چکی تھی۔ ملک کے روشن خیال طبقوں کو خاموش کرنے کی مہم پوری قوت سے جاری تھی۔ سیکولر اور لبرل اقدار پر یقین رکھنے والوں کے لیے زمین تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ انتخابات نے کوئی موثر اپوزیشن باقی نہیں چھوڑی تھی۔ مسلمان شدید قسم کی مایوسی کی نفسیات کے شکار تھے جس کی جڑیں گذشتہ پانچ سال کے تجربات اور واقعات میں پیوست ہیں۔ چنانچہ ظاہری طور پر اب ان مقاصد کے حصول کے راستہ میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں بچی تھی۔ محسوس ایسا ہوتا تھا کہ ملک میں پولرائزیشن کا عمل مکمل ہو چکا ہے اور اب دونوں قوموں کے درمیان اشتراک اور اتحاد عمل کے امکانات اگر یکسر ختم نہیں ہو چکے ہیں تو بے حد محدود ضرور ہو چکے ہیں اور تنہا مسلمان اس پوزیشن میں نہیں رہ گئے ہیں کہ ان کا راستہ روک سکیں۔ مسلمانوں کو اس حد تک حاشیہ پر ڈھکیل دیا گیا تھا کہ اب ان کے ووٹ کی بھی کوئی قیمت اور اہمیت باقی نہیں رہی تھی۔ سیکولر پارٹیاں بھی مسلمان اور سیکولرازم کا نام لینے میں احتیاط برتنے لگی تھیں۔ اس پوری صورت حال کے تناظر میں حکومت نے محسوس کیا کہ شاید اب وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کو ہندو راشٹر میں تبدیل کرنے کے لیے فیصلہ کن تبدیلیوں کا آغاز کردیا جائے اور مسلمانوں کو دستوری اور قانونی طور پر دوسرے درجہ کے شہری بنانے کے کام کی ابتدا کردی جائے، چنانچہ دوسرے دور حکومت کے شروع ہوتے ہی نہایت عجلت میں طلاق ثلاثہ کا بل منظور کرایا گیا۔ یہ بل ۳۰/جولائی ۲۰۱۹ء کو منظور ہوا۔ اس کے چند دنوں بعد ہی ۵/اگست کو دفعہ ۳۷۰ کو منسوخ کردیا گیا۔ اسی تناظر میں بابری مسجد کے فیصلہ کو

بھی لیا جاسکتا ہے۔ یہ سب حد درجہ غیر معمولی واقعات تھے لیکن یہ سب مختلف اسباب کی وجہ سے جس طرح خاموشی سے گزر گئے اس سے حوصلہ پا کر شہریت ترمیم بل جیسے اہم اور حساس بل کو بھی بغیر کسی مناسب صلاح ومشورہ کے نہایت عجلت میں پاس کرالیا گیا۔ یہ سب راجیہ سبھا میں حکمراں اتحاد کی واضح اکثریت نہ ہونے کے باوجود ہوا۔ پورے ملک میں این۔آر۔سی کے نفاذ کی دھمکی پہلے ہی سے دی جارہی تھی اور جس انداز اور لب ولہجہ میں دی جارہی تھی اس سے واضح تھا کہ اس کی زد پر کون لوگ تھے۔ اس پس منظر میں سی۔اے۔اے کے مضمرات حد درجہ اہمیت کے حامل تھے، چنانچہ بجا طور پر اسے ہندو راشٹر کی طرف پیش قدمی کا پہلا قدم تصور کیا گیا۔

قومی سطح پر اس فیصلہ کا جو ردعمل ہوا وہ حکومت کے لیے یکسر غیر متوقع تھا۔ حکومت نے اس سلسلہ میں جو بیانیہ تیار کیا تھا اس کی رو سے یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ ان کے خیال میں ملک کی آبادی کے دوسرے طبقات کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی۔ دراصل انھوں نے ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کو سمجھنے میں غلطی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ ایک صدی سے آر۔ایس۔ایس جس طرح سے منصوبہ بند طریقہ سے اکثریتی طبقہ کے دل ودماغ کو مسلمانوں کے خلاف زہر آلود کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے اور جس طرح گذشتہ ساڑھے پانچ سال سے حکومت نے اپنے تمام وسائل اور اپنی تمام قوت اس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کی ہے اس کے پیش نظر وہ اسی نتیجہ تک پہنچ بھی سکتے تھے۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت اب مسلمانوں اور ان کی تاریخ کے بارے میں وہی نظریات رکھتی ہے جن پر سنگھ پریوار یقین رکھتی ہے۔ اس غلط فہمی کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو آزادی کی جنگ میں شریک تھے اور نہ اس فلسفہ اور ان نظریات سے ان کو کوئی واقفیت ہے جو تحریک آزادی کے زیر سایہ یہاں پروان چڑھے اور جن کے اثرات بہت وسیع اور جن کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس کے علاوہ خود دستور سے ملک کے باشندوں کی وابستگی بہت گہری ہے۔ چنانچہ وقتی جذبات کے دوش پر سوار ہوکر وہ دوبارہ اقتدار پر قابض ہونے میں کامیاب تو ہوگئے لیکن ان کی تمام تر کاوشوں کے باوجود ملک کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ قوم پرستی اور ہندوستان کی تاریخ کی اس تعبیر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس کو یہ پیش کرتے ہیں۔ اگر ہندو مسلم تعلقات میں کشیدگی کی تاریخ، تقسیم ملک کے اثرات اور فرقہ پرست طاقتوں کے انتہائی جارحانہ پروپیگنڈہ کو ذہن میں رکھا جائے تو یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی سماج کے مختلف طبقات جس

طرح کھل کر اس قانون کی مخالفت میں میدان میں آئے وہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کو نہ صرف محسوس کرنا چاہیے بلکہ کھلے دل سے اس کا اعتراف اور اس کی قدر کرنی چاہیے اور امکان کی حد تک اس کو تقویت پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس جابرانہ، غیر منصفانہ اور غیر دستوری قانون کے خلاف سب سے پہلا ردعمل آسام اور شمال مشرق کی دوسری ریاستوں میں ہوا۔ وہاں کے مخصوص پس منظر میں اس کی توقع بھی تھی۔ وہ اسے اپنے ساتھ کھلا ہوا دھوکہ اور آسام اکارڈ کی خلاف ورزی سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد اس مشعل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ دونوں جگہوں پر مظاہرے پرامن تھے۔ اسی دوران جامعہ میں ایک مظاہرہ کے دوران یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر پولیس کیمپس میں داخل ہوگئی اور پرامن طلبہ کے ساتھ جو سفاکانہ برتاؤ کیا اس کی تصویر کشی کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ انہوں نے نہ تو طلبہ اور طالبات کے درمیان کوئی امتیاز کیا اور نہ لائبریری اور مسجد کے تقدس کا کوئی لحاظ کیا۔ وہ تو طالبات کے ہاسٹل اور واش روم تک میں گھس گئے۔ اس کے نتیجہ میں ایک بڑی تعداد میں طلبہ اور طالبات زخمی ہوئے۔ اس تشدد کی خبر علی گڈھ پہنچی تو طلبہ میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ صورت حال پر قابو پانے کے لیے یونیورسٹی انتظامیہ نے پولیس کی مدد طلب کرلی۔ اس طرح پولیس اور آر۔اے۔ایف کو بڑی تعداد میں کیمپس میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بڑی غلطی تھی اور اس کی ذمہ داری کا تعین ہونا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے وہی کچھ کیا جس کے لیے وہ جانے اور پہچانے جاتے ہیں اور خاص طور پر جو اقلیتوں اور کمزور طبقات کے سلسلہ میں ان کی شناخت بن چکی ہے۔ اس کی جو تفصیلات دستیاب ہوسکی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی حملہ آور فوج کسی دشمن ملک میں داخل ہوگئی ہے۔ پولیس کمروں تک میں گھس گئی اور بڑی تعداد میں طلبہ زخمی ہوئے۔ اس بے مہار تشدد میں جسم و جان اور املاک کا جو نقصان ہوا اس سے کم وہ اذیت نہیں تھی جو پولیس فورس کی غیر مہذب اور انتہائی جارحانہ فرقہ پرستانہ دشنام طرازی سے پہنچی۔ جامعہ اور علی گڈھ دونوں جگہ جسم و جان کے ساتھ ساتھ دل و دماغ بھی بری طرح مجروح ہوئے۔ دوسری یونیورسٹیوں میں اس سے بڑے واقعات پر اس طرح طاقت کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ کسی بھی متمدن ملک میں طلبہ کے ساتھ یہ سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ طلبہ تو ملک کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ملک کے اجتماعی ضمیر کے محافظ تو وہی ہوتے ہیں۔ مستقبل کی تمام امیدیں انہی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ ان دونوں دانش گاہوں میں طاقت کے غیر معمولی استعمال اور اس حد تک تشدد

کا مقصد شاید یہ تھا کہ اس تحریک کو ابتدا ہی میں اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ یہیں دم توڑ دے۔ غلط فہمی یہ تھی کہ یہ مسلمانوں کا مسئلہ ہے اور اسی لیے ان مسلمان اداروں سے باہر ان کے لیے کوئی آواز نہیں اٹھے گی۔ اگر ان کو اسی مرحلہ میں سختی سے کچل دیا گیا تو بات یہیں ختم ہو جائے گی۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ بڑی غلط فہمی تھی۔ ان بہادر طلبہ کی قربانی وہ رنگ لائی کہ اب ملک کے کونے کونے سے یہی صدا آرہی ہے۔ ملک کی تاریخ کے اس نازک موڑ پر جب امیدیں دم توڑ رہی تھیں اور مایوسیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے وطن عزیز کے مطلع پر ایک نئی صبح امید کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اس کا کریڈٹ سب سے زیادہ جامعہ اور اسی کے ساتھ علی گڈھ کے طلبہ کو جاتا ہے۔

جب ان دونوں یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات کے ساتھ اس بے رحمانہ اور وحشیانہ سلوک کی اطلاع ملک میں پھیلی تو اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا وہ حکومت کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ اس ظلم و جبر سے خوف زدہ ہونے یا لاتعلقی کا طرز عمل اختیار کرنے کے بجائے اس ملک کے نوجوان نے وہ کیا جس کی توقع کم از کم حکومت کو تو ہرگز نہیں تھی۔ ملک کا نوجوان آئین کی اس بے حرمتی اور اس ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ ملک بھر میں پھیلی ہوئی یونیورسٹیوں کے طلبہ اور طالبات ہاتھوں میں ترنگا، دستور کی کاپیاں، گاندھی جی اور ڈاکٹر امبیڈکر کی تصویریں اور سی-اے-اے کے خلاف بینر اٹھائے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ یہ سب کچھ بالکل اچانک اور از خود ہوا۔ ہر شخص نے یہ محسوس کیا کہ دستور خطرے میں ہے اور بغیر کسی تردد کے باہر نکل پڑا تا کہ اس عظیم جدو جہد میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ ان کا ساتھ دینے کے لیے وہ لوگ بھی نکل کھڑے ہوئے جو آئین کی بالادستی پر یقین رکھتے ہیں، جو ملک کی سیکولر اور لبرل روایات کو عزیز رکھتے ہیں، جو جنگ آزادی کے مجاہدین کی وراثت ہے اور اس ملک کی سب سے قیمتی پونجی ہے۔ یہ سب لوگ ملک کے دستور اور اس کی ساجھی وراثت کی حفاظت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر چشم فلک نے وہ منظر دیکھا جو ایک مدت سے دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانوں کا ایک ہجوم تھا جس میں ہر مذہب اور ہر فکر و خیال کے لوگ شامل تھے البتہ اس کی غالب اکثریت نوجوان مردوں اور عورتوں پر مشتمل تھی۔ ایسا مظاہرہ ۱۹۷۴ء کے بعد ملک میں نہیں دیکھا گیا۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اپنی وسعت اور جذبات کی شدت کے لحاظ سے یہ مظاہرے اس سے بھی زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ البتہ دونوں مظاہروں میں ایک بڑا فرق ہے۔ ایمرجنسی کے خلاف ہونے والے مظاہرے صرف آمریت اور

حکومت کے جبر کے خلاف تھے۔ اس وقت آمریت اور حکومتی جبر کے ساتھ ساتھ اس میں شدید نوعیت کی فرقہ پرستی بھی شامل ہے۔ اس لیے اس کا مقابلہ بھی زیادہ مشکل ہے۔ چنانچہ یہ مظاہرے اپنی وسعت اور نوعیت کے لحاظ سے بے مثال ہیں۔ ان مظاہروں میں جتنی یونیورسٹیاں شریک ہوئیں اس کی بھی ماضی میں کوئی مثال نہیں۔ جن یونیورسٹیوں کے طلبہ نے ان میں شرکت کی ان میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے طلبہ بھی شامل ہیں جن میں سے کئی ابھی تک جیل میں ہیں۔ ملک سے باہر بھی طلبہ کی حمایت اور اس قانون کی مخالفت میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے۔ ان میں دنیا کی مشہور ترین یونیورسٹیاں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان اور دنیا کے دوسرے ملکوں سے تعلق رکھنے والے سرکردہ اہل علم ودانش نے بھی بڑی تعداد میں اس کے خلاف آواز بلند کی۔

ان مظاہروں کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس کی کوئی مرکزی قیادت نہیں ہے۔ پورے ملک میں یہ بالکل اچانک اور از خود ظہور پذیر ہوئے۔ ایک جذبہ تھا جو بغیر کسی کے کہے اور بلائے خود کشاں کشاں لوگوں کو گھر سے باہر لایا۔ ہر جگہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کچھ لوگ آگے آئے اور بالعموم یہ سب نوجوان اور طالب علم ہیں۔ موجودہ حالات میں ہندوستان کے مستقبل اور دستور کی حفاظت کا کام نوجوان ہی کر سکتے ہیں۔ ان کے اوپر کوئی قیادت مسلط کرنے کی کوشش مناسب نہیں ہوگی۔ یہ انہی کا کام اور اس کو انہی کو کرنے دیا جائے۔ انہوں نے وقت کی اس اہم ترین ضرورت کو سمجھا اور اس کو انجام دینے کے لیے آگے بڑھے۔ اب وہی اس کو پورا بھی کریں گے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس تحریک میں طالبات نے جس غیر معمولی جرأت، بہادری اور پامردی کا ثبوت دیا وہ ایک مثال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ پولیس کے سامنے بے خوفی سے انگلی اٹھائے ہوئے جامعہ کی ایک طالبہ اب اس تحریک کی علامت بن چکی ہے۔ جامعہ، علی گڑھ، شاہین باغ اور ملک کے دوسرے حصوں میں موسم کی شدت کے باوجود طالبات اور دوسری خواتین جس حوصلہ، عزم اور جوش وخروش سے اس تحریک میں حصہ لے رہی ہیں وہ ملک کے مستقبل کے لیے بہت خوش آئند ہے۔

پورے ملک میں بہت بڑے بڑے مظاہرے ہوئے اور سب بلا استثناء پرامن رہے، سوائے ان ریاستوں کے جہاں بی۔جے۔پی کی حکومت ہے۔ مظاہرہ کرنے کا حق ایک جمہوری حق ہے اور اس سے کسی کو محروم نہیں کیا جا سکتا لیکن بی جے پی کے زیر حکومت ریاستوں میں مظاہرین کو روکا گیا اور پھر ان کو تشدد کی راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ پولیس نے خود تشدد کو ہوا دی اور

پھر اسی کو بہانہ بنا کر ظلم وتشدد کا جو بازار گرم کیا وہ تمام حدوں کو پار کر گیا۔ مغربی یوپی، کانپور اور دوسرے متاثرہ علاقوں سے اب جو اطلاعات اور ویڈیو آرہے ہیں ان کو دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ایسی درندگی اور ایسی سفاکی جس کا تصور بھی مشکل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی فرقہ پرستانہ، نفرت آمیز گالیاں جیسے معاملہ اپنے شہریوں کے بجائے دشمنوں سے ہو۔ جب پولیس کے سینئر آفیسر مسلمانوں سے پاکستان چلے جانے کے لیے کہنے لگیں اور جب اس قسم کے نعرے لگیں کہ مسلمان کے دو استھان پاکستان یا قبرستان، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صورت حال کتنی خراب ہوچکی ہے۔ یوپی کے وزیر اعلیٰ نے مظاہرین سے انتقام لینے کی بات کی تھی اور یہ انتقام جس طرح لیا گیا وہ ظلم وناانصافی کی تمام حدوں کو پار کر گیا۔ اس میں جو جانی نقصان ہوا وہ خود بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ رات کی تاریکی میں گھروں میں گھس کر جس طرح بلا امتیاز مردوں، عورتوں اور بچوں کو زدوکوب کیا گیا اور تمام اثاثوں کو تباہ و برباد کردیا گیا وہ حد درجہ انسانیت سوز ہے۔ بڑے پیمانوں پر گرفتاریوں کے علاوہ بغیر کسی عدالتی چارہ جوئی کے کاروبار کو سیل کرنے اور متاثرہ علاقوں سے ہرجانہ کی جبری وصولی کی کارروائی کی جارہی ہے۔

پوری صورت حال کو سامنے رکھا جائے تو اس امر میں شبہہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے کہ حکومت اس معاملہ میں زمینی حقائق کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ بحیثیت مجموعی ملک کے باشندوں کو دستور سے گہری وابستگی ہے اور وہ اس کی حفاظت کے لیے فکرمند ہیں۔ چنانچہ گذشتہ دنوں میں دستور کی فروخت میں بہت اضافہ ہوا ہے اور اس کے مطالعہ میں دلچسپی بڑھی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ حکومت آسانی سے اس قانون کو واپس نہیں لے گی۔ اس وقت حالات کے دباؤ میں حکمرانوں کے انداز میں کسی قدر نرمی کے جو آثار نظر آرہے ہیں وہ محض حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت ہیں۔ این۔پی۔آر کا شاخسانہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اب یہ بات واضح ہوچکی ہے کہ این۔پی۔آر دراصل این۔آر۔سی کی طرف پہلا قدم ہے۔ حکومت اس سلسلہ میں کتنی سنجیدہ ہے اور اس معاملہ میں اس کے اوپر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے اس کا اندازہ رام لیلا گراؤنڈ میں وزیر اعظم کی تقریر سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایکٹ دستوری تقاضوں کی صریح خلاف ورزی کرتا ہے اس لیے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ یہ عدالت عالیہ سے مسترد ہوجائے گا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو یہ ایک لمبی لڑائی ہے اور اسی لحاظ سے اس کی تیاری کی جانی چاہیے۔ یہ بات البتہ اطمینان کی باعث ہے کہ ایک قابل لحاظ تعداد میں ریاستوں نے اسے اپنے حدود میں نافذ کرنے سے انکار کردیا ہے۔ اس میں بعض وہ ریاستیں بھی شامل ہیں جن میں

حکمراں پارٹیوں نے پارلیمنٹ میں اس کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ظاہر ہے یہ تبدیلی عوامی دباؤ کا نتیجہ ہے۔یہ بات بھی بہت خوش آئند ہے کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کی بڑی اکثریت اس قانون کے خلاف ہے اور اپنے اپنے انداز میں اس کی مخالفت میں سرگرم عمل ہے۔

مظاہرے اب بھی جاری ہیں۔روز کسی نئے شہر اور کسی نئے علاقے بلکہ علاقوں سے مظاہروں کی خبریں مسلسل آرہی ہیں۔ترنگے کے سایے میں اہل وطن ہاتھوں میں دستور ہند کی کاپیاں، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر امبیڈکر کے پورٹریٹ اور سی۔اے۔اے کے خلاف بینر اٹھائے بڑی تعداد میں سڑکوں پر نظر آتے ہیں۔ایک ایسے وقت میں جب ملک میں اکثریتی نفسیات کا اس حد تک غلبہ ہوگیا تھا کہ اس کو چیلنج کرنا ناممکن نظر آنے لگا تھا، جب سیکولرازم کا نام بھی لینا مشکل ہوتا جارہا تھا، جب ملک ایک طرح سے غیر اعلان شدہ ایمرجنسی سے گزر رہا تھا اور جب اختلاف رائے اور سوال پوچھنے کے مواقع کم سے کم ہوتے جارہے تھے، ایسے مایوس کن ماحول میں اس ملک کے نوجوانوں کی قیادت میں اہل وطن کا دستور کے دفاع اور اپنی آبادی کے ایک حصہ کے حقوق کی حفاظت کے لیے اس طرح اٹھ کھڑے ہونا ملک کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن لمحہ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے اس کی آئندہ سمت سفر طے ہوگی۔ملک کے موجودہ ماحول میں اس تحریک کی حیثیت تازہ ہوا کے جاں بخش جھونکے اور امید کی ایک کرن کی ہے۔اس تحریک کو تقویت پہنچانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔البتہ یہ ضروری ہے کہ اس تحریک کو مذہبی رنگ نہ دیا جائے اور نہ اس کو مسلمانوں کے ایک مسئلہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ممکن حد تک احتیاط ضروری ہے۔یہ دستور کی حفاظت اور آئین کی روح کے دفاع کا مسئلہ ہے اور یہ سماج کے مختلف طبقات کی مشترکہ کوششوں ہی سے حل ہوسکتا ہے۔ یہ بات بہت ضروری ہے کہ ہر طرح کی اشتعال انگیزی کے باوجود ان مظاہروں کو مکمل طور پر پرامن رکھا جائے۔ اب جب کہ حکومت کی ایما پر اس ناقابل دفاع قانون کے دفاع میں بھی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔اس کے علاوہ بھی اس سلسلہ میں بہت سے مسائل ہیں جن کی طرف بروقت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔اس سلسلہ میں کام بھی ہورہا ہے۔امید ہے کہ الائنس اگینسٹ سی۔اے۔اے، این۔آر۔سی، ینگ انڈیا اگینسٹ سی۔اے۔اے، این۔آر۔سی، این۔پی۔آر اور اس طرح کی دوسری تنظیمیں جو خاص طور سے اسی مقصد کے لیے قائم ہوئی ہیں ان امور پر خاطر خواہ توجہ دیں گی اور اس خلا کو پر کرنے کا کام کریں گی جو اس سلسلہ میں نظر آرہا ہے۔

مقالات

حافظ مغلطائی کی کتاب

"الزھر الباسم فی سیر ابی القاسم"

☆ ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

مصادر سیرت نبوی کی تلاش و انتخاب کے ایک طویل، صبر آزما اور پیچیدہ عمل کے دوران حافظ مغلطائی کی ایک کتاب ضخیم کا پتہ چلا، مشہور کتابیات نگار سیرت و قرآن صلاح الدین المنجد کی "معجم ماالف عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم" میں اس کے واحد مخطوطہ کا سراغ محکم ملا۔ وہ مشہور عالم کتب خانہ لائیڈن میں مخطوطہ نمبر ۸۶۴ کے نمبر اندراج کے ساتھ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر المنجد نے اس کا ذکر "السیرۃ النبویۃ" کے باب میں کیا ہے۔ مصنف گرامی کا نام نامی علاء الدین مغلطائی بن قلیچ (م ۷۶۲ھ/ ۱۳۶۰ء) اور کتاب کا عنوان ذرا مختلف ثبت کیا ہے کہ سیر کی جگہ سیرۃ لکھا ہے جیسا کہ دوسروں کے ہاں بھی ہے۔ ان میں جدید دور کے اعلام و مصنّفین نگار کحالہ وغیرہ شامل ہیں۔ مخطوطہ ہو یا مطبوعہ، کتاب کے عنوان کے بارے میں ایسی طرفگی اکثر ملتی ہے (صلاح الدین المنجد، معجم ماالف عن رسول اللہ ﷺ، دار الکتاب الجدید، بیروت ۱۹۸۲ء القسم الثالث، ۴: السیرۃ النبویۃ: نمبر ۱۰۸)۔ مخطوطہ واحدہ ہونے کے سبب اس کے حصول و مطالعہ و شمول کی بڑی حسرت تھی لیکن وہ تلاش بسیار اور کوشش فراواں کے باوجود خاکسار کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ خوش قسمتی سے وہ ایک اور عاشق سیرت نبوی اور کتابوں کے رسیا مفتی محمد سعید خاں، اسلام آباد، کو میری نشاندہی پر میسر آ گیا۔ مفتی موصوف نے اسے اپنے ایک عزیز معاون و نگرانِ کتب خانہ مولانا احسن احمد عبدالشکور سے مرتب و محقق کرا کے جمہوریہ مصر کے مکتبہ دار السلام قاہرہ سے ۱۴۳۳ھ/ ۲۰۱۲ء میں دو جلدوں میں شائع کرا دیا۔ دونوں جلدوں میں صفحات مسلسل

☆ پروفیسر، صدر، ڈائریکٹر (سابق) ادارہ علوم اسلامیہ و شاہ ولی اللہ دہلوی ریسرچ سیل، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہیں اوران کی مجموعی ضخامت ۱۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے (جلداول: ۱-۷۴۱ + جلد دوم ۷۴۲-۱۴۲۰)، اس میں شروع کے ۵۸ صفحات محقق عزیز کے مباحث بابتہ مصنف و کتاب ومخطوطہ کے شامل ہیں۔ سرورق پرعنوان کتاب ''الزھر الباسم فی سیر فی ابی القاسمﷺ'' ''تالیف الامام الحافظ النسابه مغلطائی بن قلیج البکجری'' (۶۹۰/۱۲۹۱-۷۶۲/۱۳۶۰) کی معمول کی سطروں کے بعد ''حققه وعلق علیه: احسن احمد عبدالشکور'' اور جلد نمبر اور مکتبہ دارالسلام ثبت کیا ہے۔ خاکسار راقم نے مصادر سیرت نبوی کے عظیم الشان باب ''اسلام کا علمی وثقافتی ورثہ'' انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی جلد دوم مطبوعہ سنہ ۲۰۱۶ء میں حافظ مغلطائی کی کتاب سیرت مختصر کے ضمن میں اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ تالیف وتصنیف کے طویل مرحلہ میں بیسویں صدی عیسوی کا اواخر کا نوشتہ ہے لیکن ترتیب وکتابت اوراشاعت کے طویل وصبر شکن مراحل میں سے گزرتا ہوا قریب قریب بیس سال بعد منظر عام پر آسکا۔

اس میں کتاب الزہر الباسم کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے: (۲) ''الزھر الباسم فی سیرۃ ابی القاسم'' کا عنوان کحالہ وغیرہ کے ہاں ملتا ہے جب کہ حافظ ابن حجر اور ابن العماد حنبلی نے ''الزھر الباسم فی سیرۃ النبویۃ'' عنوان بتایا ہے۔ اسی طرح سیرت کے فن میں ان کی دو اور کتابوں کا پتہ چلتا ہے۔'' پھر مخطوطہ لائیڈن کا ذکر اور اس کے حصول کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سے قبل ان کی دستیاب کتاب مختصر کا تعارف دیا گیا ہے: ''الاشارۃ الیٰ سیرۃ المصطفیٰ و تاریخ من بعدہ من الخلفاء'' ان کی مشہور سیرت نبوی ہے جو ہمارے زیر مطالعہ ہے'' اوراس کے بارے میں کچھ تفصیل ہے۔ ''طریقہ تالیف'' کے ذیلی عنوان کے تحت مزید تفصیل یہ دی گئی ہے کہ ''حافظ مغلطائی کی کتاب سیرۃ ان کے عنوان کے موافق سچ مچ سیرۃ المصطفیٰ کے بحر زخار کی طرف محض اشارہ ہی ہے جیسا کہ انھوں نے خود اپنے مقدمہ کتاب میں تصریح کی ہے۔ ان کی یہ کتاب مختصر دراصل ان کی ضخیم اور بنیادی کتاب ''الزھر الباسم فی سیرۃ ابی القاسم'' کی تلخیص ہے جو انھوں نے اپنے شیخ قاضی القضاۃ جلال الدین قزوینی (۶۶۶/۱۲۶۷-۷۳۹/۱۳۳۸) کے تقاضے پر کی تھی اوراس سے مدعا یہ تھا کہ عام قارئین ان کی ضخیم اور علمی کتاب سے استفادہ کرنے کے اہل نہیں لہٰذا وہ اس تلخیص میں عطر سیرت کشید کرکے ان کے افادہ کے لیے پیش کردیں''۔ مولانا شبلی نے اپنے مقدمہ سیرۃ النبی میں صرف مختصر

سیرت کے بارے میں لکھا ہے: ''سیرت مغلطائی مشہور کتاب ہے اور مصر میں چھپ گئی ہے۔ علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے جس کا نام ''کشف اللثام'' ہے۔ مولانا موصوف نے اس کا ذکر کشف الظنون کے حوالہ سے حاشیہ میں کیا ہے۔ ان کو حافظ مغلطائی کی کتاب ضخیم ''الزهر الباسم فی سیرۃ ابی القاسم'' کے بارے میں خبر نہ ہوسکی کہ وہ اس وقت تک خزینۃ الکتاب میں مدفون تھی اور انھوں نے حافظ موصوف کی کتاب مختصر بھی نہ دیکھی تھی ورنہ ان کو اس کتاب مفصل و ضخیم کا کم از کم علم ہوجاتا گرچہ نوعیت کتاب سے بے خبری رہتی۔

(مصادر سیرت نبوی: ۲/۱۸۲، شبلی/سلیمان، سیرۃ النبی، مقدمہ، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء، ۱/۳۶؛ الزهر الباسم، مذکورہ بالا، مقدمۃ المحقق میں مصنف کی کتب بہ ترتیب ہجائی میں یہ تبصرہ ہے: (۶) الاشارۃ...... قال التقی الفاسی عنه (العقد الثمین، ۱/۲۱۷ بلا سنہ طباعت و مطبعہ): ''وفیه من الفوائد النفیسة مالا یوجد فی کثیر من الکتب المبسوطة فی هذا المعنی، طبع قدیما بمطبعة السعادة بمصر سنة (۱۳۲۶ھ) وحدیثا بتحقیق نظام الدین الفتیح، وآسیة کلیبان''۔)

قاضی جلال الدین محمد بن عبدالرحمن بن عمر القزوینی الشافعی، ابوالمعالی کنیت رکھتے تھے اور خطیب دمشق کہلاتے تھے، فصاحت و بلاغت میں طاق، گہرے علم کے حامل اور حسن اخلاق سے آراستہ تھے۔ مغلطائی ان سے مدتوں وابستہ رہے اور اپنی کتاب الاشارۃ کے اوائل میں ان کی تعریف کی ہے اور بیان کیا ہے کہ انھوں نے کتاب الاشارۃ الی سیرۃ المصطفیٰ ﷺ ان کی طلب پر تالیف کی۔ مقدمہ محقق کے اس نوٹ میں ان کی تلخیص کرنے کا اشارہ نہیں ہے، ۱/۲۶۔

حافظ مغلطائی کی دوسری تالیفات میں شامل ہیں: ۱۔ التحفة الجسیمة فی اثبات اسلام حلیمة''، مصنف گرامی نے الزهر الباسم میں داراحیاء التراث العربی بیروت، بلا سنہ اور اسماعیل پاشا نے ایضاح المکنون میں اس کا ذکر کیا ہے بقول محقق (۱/۳۳، حاشیہ: ۹، شبلی، ۱/۱۷۴، حاشیہ: ۲ بحوالہ زرقانی، ۱/۱۶۶) ۲۔ خصائص المصطفیٰ ﷺ/ معجزات النبی ﷺ، مکتبہ محمودیہ مصر غیر مورخہ، ۳۔ دلائل النبوۃ بقول محقق غالباً وہ اعلام النبوۃ نامی کتاب ہے جیسا کہ الاشارۃ کے مرتب و محقق نظام الدین الفتیح نے اپنے مقدمہ الاشارہ میں لکھا ہے۔ ۳۔ ''السیرۃ السریة فی

مناقب خیر البریۃ'' (مخطوطہ اسکندریہ بحوالہ الفہرس الشامل: ۱/۲۴۴،۴۔فضائل النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، مخطوطہ نیجریا نمبر متحف: ۴ بحوالہ الفہرس الشامل: ۱/ ۷۷۶)۔

نوعیت کتاب الزہر الباسم: عام طور سے حافظ مغلطائی کی اس جامع وضخیم اور علمی وتحقیقی کتاب کو سیرت نبوی کی تالیف لطیف ہی سمجھا جاتا ہے۔محقق احسن احمد عبدالشکور نے بھی اپنے مقدمہ میں الکتاب کی بحث میں اسے کتاب سیرت ہی بتایا ہے اور متعدد دوسرے اہل علم نے بھی یہی لکھا ہے۔ البتہ محقق موصوف کو کتاب مستطاب کی تحقیق وتعلیق کا سنہری موقعہ ملا تو ان کو کتاب کی صحیح نوعیت یا موضوع متعین کرنے میں کسی قدر کامیابی ملی۔یہ کتاب دراصل امام ابن اسحاق/ امام ابن ہشام کی کتاب السیرۃ النبویۃ اور امام عبدالرحمن سہیلی کی تالیف الروض الانف کے تنقیدی مطالعہ پر مبنی ہے۔اس پر یہ اضافہ موزوں لگتا ہے کہ امام ابن اسحاق (محمد بن اسحاق بن یسار: ۸۵/۷۰۴۔۱۵۰/ ۷۶۷) کی کتاب سیرت کے مختلف متون وروایات (recensions) میں سے امام ابن ہشام (عبدالملک بن ہشام، م ۲۱۸/۸۳۳) کی کتاب السیرۃ النبویۃ امام اول کے ایک شاگرد و مرتب متن امام بکائی (زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی، م ۱۸۳/ ۷۹۹) کی روایت سیرت ابن اسحاق پر مبنی ہے۔مولانا شبلی نے اپنے مقدمہ سیرۃ النبی میں امام بکائی اور امام ابن ہشام دونوں کے تذکرے میں اول اول اس حقیقت کا اظہار کیا اور امام اول کے دوسرے شاگردوں اور ان کی سیرت کے رواۃ اور اپنی قراءت و سماعت سے کتاب ابن اسحاق کا دوسرا متن تیار کرنے والوں میں سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری (م ۱۹۱/۸۰۶) کا ذکر کیا ہے جن سے طبری نے اکثر روایتیں لی ہیں۔اصلاً طبری کا ماخذ سیرت وہی ہیں۔شبلی نے امام ابن اسحاق کے دوسرے شاگرد اور مرتب روایات سیرت یونس بن بکیر (م ۱۹۹/ ۸۱۴) کا ذکر کیا ہے اور زرقانی کی مواہب ۳/ ۱۰ کے حوالہ سے نہ جانے کیوں یہ لکھ دیا کہ ''انھوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے''، حالانکہ وہ امام سیرت اول کی دوسری قراءت وروایت ہے۔امام عبدالرحمن سہیلی (م ۵۸۱/۱۱۸۵) کی کتاب الروض الانف کے بارے میں مولانا شبلی کا بیان ہے کہ ''وہ سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے'' جب کہ درحقیقت سیرت ابن ہشام کی شرح ہے جیسا کہ صلاح الدین المنجد نے عنوان ہی دیا ہے: ''الروض الانف فی شرح سیرۃ ابن ھشام'' دوسرے محققین و مرتبین کتاب الروض الانف کے علاوہ اصل صاحب کتاب نے بھی یہی تصریح کی ہے کہ وہ امام ابن

ہشام کی تالیف لطیف کی شرح ہے۔

(الزہر الباسم، ۱/ ۷، ۴۲: موخر الذکر صفحہ پر ہے: دراسة نقدية للسيرة النبوية لابن اسحاق، یہ بایں طور صحیح ہے کہ وہ بہرحال ابن اسحاق کی روایت ہے؛ شبلی، ۱/۲۴-۳۵، صلاح الدین المنجد، معجم السيرة النبوية کے اندراجات؛ خاکسار راقم، مصادر سیرت نبوی، ۱/۱ ۷-۹۴ ومابعد: ۲/ ۱۸۰-۱۸۱ ومابعد، مولانا شبلی اور متعدد دوسرے محققین امام ابن اسحاق کی کتاب سیرت کا عنوان مغازی ابن اسحاق لکھتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ آغاز میں کتب سیرت بالعموم مغازی کے عنوان سے جانی جاتی تھیں۔ امام ابن اسحاق کی کتاب سیرت ''کتاب المبدا والمبعث والمغازی'' کے عنوان سے اہل علم میں ہمیشہ معروف رہی اور اسی طرح امام واقدی کی کتاب ''التاریخ والمبعت والمغازی'' کے عنوان اصلی سے۔ مغازی تو ان کی کتابوں کا تیسرا حصہ ہے اور وہ صرف مغازی/غزوات وسرایا کی داستان نہیں بلکہ مدنی دور کی سیرت نبوی کا حصہ ہے بالخصوص امام ابن اسحاق کا۔ متقدمین کی شہادتیں اس امر پر بہت کافی ہیں (ملاحظہ ہو: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیرۃ محمد ابن اسحاق، رباط ۱۹۶۷، مرتبہ سہیل زکار، بیروت ۱۹۷۸؛ اردو ترجمہ بعنوان سیرت ابن اسحاق، نور الٰہی ایڈوکیٹ، نقوش رسول نمبر، ۱۲، لاہور ۱۹۸۵ء بالخصوص محاکمہ محقق؛ مقالات خاکسار، امام ابن اسحاق شاہ ولی اللہ کے اہم ترین ماخذ سیرت، تحقیقات اسلامی علی گڑھ اپریل - جون، ۲۰۱۲، تاریخ طبری میں سیرت نبوی کے مآخذ، معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۲۰۱۰ء وغیرہ)۔

موضوع کتاب الزہر الباسم: متن کتاب اور محقق متن کے تبصرہ سے موضوع الزہر الباسم کا صریح تعین تو ہوا ہی ان کی مختصر سیرت الاشارہ کا بھرم بھی کھل گیا۔ الزہر الباسم بنیادی طور سے مصادر سیرت نبوی کی مانند ایسی کتاب نہیں ہے جو احوال و واقعات سیرت طیبہ کو تاریخی بیانیہ میں پیش کرے۔ وہ مختلف اور گوناگوں تنقیدی مباحث سیرۃ ابن اسحاق/ابن ہشام اور شرح سہیلی پر مؤلف گرامی کے استدراکات ونقد سے تعرض کرتی ہے۔ اس کے برخلاف مغلطائی کی کتاب ''الاشارہ'' سیرت مطہرہ کے واقعات اور احوال کا تاریخی وموضوعاتی بیانیہ رکھتی ہے اور عہد نبوی کو خلافت اسلامی کے مختلف ادوار سے مربوط کرتی ہے اور اپنی تالیف کے زمانے تک دراز کرتی ہے۔ وہ بنیادی طور سے تاریخ اسلامی کی کتاب بن جاتی ہے اور سیرت کا حصہ غالب ہونے کے باوجود مختصر سیرت کا منہج وطریق

رکھتی ہے اور خلافت اسلامی کا بیانیہ خالص تاریخی بیانیے کا ہے۔ اس موازنہ سے یہ بھرم کھل جاتا ہے کہ حافظ مغلطائی کی کتاب الاشارہ ان کی ضخیم و عظیم کتاب الزہر الباسم کا خلاصہ/تلخیص ہے۔ حافظ مؤلف کے مقدمہ الاشارہ میں اس بیان سے کہ وہ ان کی ضخیم کتاب کی تلخیص ہے متاخرین میں سب ہی کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ تلخیص کتاب اکبر ہے حالانکہ ان کے اس مبینہ بیان و اشارہ کا مطلوب و مقصود یہ تھا کہ عام قارئین کے لیے انھوں نے اپنے استاذ و شیخ کی فرمائش پر ایک سہل کتاب لکھ دی جو ان کے سیرتی فن پر تبحر اور خاص الزہر الباسم کی تالیف و تصنیف سے حاصل شدہ فنی دسترس کی وجہ سے سیرت طیبہ کے بحر زخار کو ایک کوزہ میں سموگئی۔ ''الزہر الباسم'' کا موضوع سیرت نگاروں کے عام زمرے سے زیادہ ناقدین و شارحین مصادر سیرت کی دلچسپی بلکہ تنقیدی تجزیہ کا ہے۔ مصنف کتاب الزہر الباسم نے اپنے مقدمہ میں نہ صرف موضوع کتاب کا بلکہ ان کی جہات رنگارنگ کا تعین و وضوح علمی انداز سے کردیا ہے۔

(مختصرات سیرت کے باب میں یہ غلط فہمی عام ہے کہ متعدد مؤلفین سیرت نے اپنی ضخیم کتابوں کی خود تلخیص کی تھی۔ حافظ مغلطائی کے علاوہ حافظ ابن سید الناس کے بارے میں یہ خیال خام قریب قریب تمام اہل علم اور مؤلفین سیرت کے ہاں ملتا ہے کہ ان کی کتاب جامع عیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر کی تلخیص مصنف نے کی تھی اور وہ ان کے رسالہ سیرت نور العیون کا متن ہے۔ حالانکہ تحقیق و تجزیہ سے ثابت ہوا کہ وہ ان کی کتاب جامع کا نہیں بلکہ محب الدین طبری کے خلاصہ کا خلاصہ ہے یا اس پر مبنی ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب خاکسار، شاہ ولی اللہ کے رسالہ کا سیرت، پھلت ۲۰۰۶ء کا مقدمہ اور نور العیون کی تالیف و تجزیہ پر بعض مقالات خاکسار ''نور العیون کا اصل ماخذ، معارف اعظم گڑھ، نومبر ۲۰۱۱ء، سرور المحزون کا تنقیدی مطالعہ، معارف اعظم گڑھ اگست ۲۰۱۰ء اور سنہ تالیف، معارف اعظم گڑھ، ستمبر ۲۰۱۰ء وغیرہ۔ دوسرے مباحث مختصرات سیرت کا ایک الگ منہج اور طریق تالیف ہے جو تاریخی و سوانحی بیانیے سے یکسر مختلف ہوتا ہے خاص کر مذکورہ دونوں مختصرات کا۔ دوسرے مشہور مختصرات/اختصارات دراصل کسی پیشرو تالیف کے خلاصے و اختصار نہیں ہوتے بلکہ کامل سیرت نبوی کی مختصر تالیفات ہیں)۔

موضوعاتی جہات الزہر الباسم: حافظ مغلطائی کا بیان ہے کہ میں اس کتاب شرح مسمی بہ الروض الانف، تالیف السہیلی کے بہت سے امور و مباحث (نبذاً) کا ذکر کروں گا جو علوم السیر کے بیس سے زیادہ فنون

پر مشتمل ہیں۔ان میں سے صرف بارہ کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا ہے:

۱۔روایتِ بکائی کے علاوہ سیرت ابن اسحاق میں جو زیادت/اضافہ ہے اس کے ذکر کے علاوہ ان روایات کو واضح کروں گا جن میں ان کو متہم کیا گیا ہے۔

۲۔ابن اسحاق نے جن روایات کو طرق ضعیفہ سے روایت کیا ہے ان کے طرق صحیحہ بتاؤں گا۔

۳۔سیرت میں اسناد یا متن کے اندر جو ابہام رہ گیا ہے اس کو واضح کروں گا۔

۴۔ان کی مقطوع، مرسل، معضل اور تعلیق روایات کو موصول و مرفوع و مسند بیان کروں گا کہ وہ دوسری کتب میں ہیں۔

۵۔ان کی مذکورہ اسانید کو صحیح اور غیر صحیح کے لحاظ سے واضح کروں گا۔

۶۔ابن ہشام نے اس کی بعض چیزوں کی تفسیر بیان کی ہے مگر وہ ابن اسحاق میں کسی دوسرے مقام پر ہے،اس کی نشاندہی کے ساتھ امام ابن اسحاق پر ابن ہشام کے اعتراض کی حقیقت واضح کروں گا۔

۷۔اس (سیرت ابن اسحاق/ابن ہشام) کی نقل میں سہیلی سے جو صریح وہم سرزد ہو گیا ہے اسے اجاگر کروں گا۔

۸۔سہیلی کے نقل کلام کی صحت لفظی پر بحث کروں گا۔

۹۔اس میں ایسی تفسیرات سہیلی بہت ہیں اور زیادہ تر اسی نوع کی ہیں جن کے مقابلہ میں دوسری تاویلات زیادہ بہتر ہیں۔

۱۰۔کلام ابن اسحاق کی ان کی بعض تشریحات و تفسیرات کے بارے میں ان کو وہم ہو گیا ہے کہ وہ کلام امام ہے،حالانکہ وہ بعض روایات میں امام ابن اسحاق سے مروی ہے یا وہ سیرت میں کلام ابن ہشام ہے یا دوسرے ائمہ کرام کا کلام ہے جو ان کو بہکا گیا۔

۱۱۔سہیلی کا یہ "زعم" بھی نظر آتا ہے کہ ابن اسحاق نے کسی چیز میں تفرد اختیار کیا یا وہم زدہ ہو گئے،حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

۱۲۔ان کے علاوہ بھی اور چیزیں ہیں اور اگر ان سب کا استیعاب کرلوں تو وہ بجائے خود ایک تصنیف بن جائے گی" (الزہر الباسم،۱/۶۰-۶۳،حواشی محقق میں اصطلاحات و بیانات اور سوانح وغیرہ سے متعلق مختلف مصادر سے تصریحات ہیں)۔

سیرت طیبہ کے اہم مباحث: ایک مفصل تنقیدی مطالعہ میں حافظ مغلطائی کی کتاب نقد و استدراک ''الزہر الباسم'' کا مبحث بہ مبحث جائزہ لیا جائے گا۔تعارف وتبصرہ پر مشتمل اس مختصر مقالے میں تمام جہات نقدو استدراک مغلطائی کا احاطہ تو درکنار ہر ایک کی چند مثالیں دینا بھی مشکل ہے۔لہٰذا خاص سیرت طیبہ کے مباحثِ ابن اسحاق/ ابن ہشام/ سہیلی سے تعرض رہے گا اور ان کو برائے افہام و تفہیم چند عناوین کے تحت لایا جائے گا۔اس سے کتاب الزہر الباسم کی مصادر سیرت نبوی میں مقام و مرتبت، فنی قدر و منزلت اور نقد و استدراک کی جودت وصحت کے علاوہ خود مصنف گرامی کی تسامحات فنی کو بھی اجاگر کرنے کا موقعہ ملے گا۔حواشی محقق کی افادیت اور بلند پائیگی بھی سامنے آئے گی اور نقدو فروما ئیگی بھی۔

امام ابن اسحاق کی توثیق: قدیم وجدید اصحاب حدیث وسیرت عموماً امام سیرت ابن اسحاق کی فن حدیث میں عدم ثقاہت/ جرح اور علم سیرت میں امامت وثقاہت یا تعدیل کے قائل ہیں۔بہت سے ان کے شیوخ ورواۃ اور تلامذہ وناقلین روایات کے حوالہ سے امام موصوف کو مورد نقد ہی نہیں ہدف طعن بناتے ہیں۔بعض قدیم اور اکا دکا جدید سیرت نگاروں نے ان کو دونوں علوم حدیث وسیرت میں ثقہ امام گردانا ہے۔ان میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور مولانا عبدالرؤف دانا پوری جیسے ماہرین حدیث و سیرت شامل ہیں۔شاہ موصوف نے تو امام ابن اسحاق کی متعدد احادیث وروایات سیرت کی سند عالی/ متصل بھی فراہم کی ہیں۔کچھ اسی طرح کی نوعیت کا کام حافظ مغلطائی نے الزہر الباسم میں کیا ہے بلکہ ان کے دامن پاک پر تدلیس کے لگے سیاہ داغ دھبوں کو صاف کیا ہے اور وہ بھی سیرت ابن اسحاق کے مباحث کے شواہد کے تناظر میں۔امام کی جلالت وامامت حدیث کا ایک برملا اظہار مغلطائی بڑا مدلل ہے:

سیرۃ ابن اسحاق میں بلا سند بیان ہے غزوہ بنی قریظہ کے باب میں: فأمر رسول الله ﷺ مؤذنا فاذن في الناس: من كان سامعا مطيعا، فلا يصلين العصر الا في بني قريظه۔ابن اسحاق نے اس حدیث کی سند یوں بیان کی ہے:''حدثني هذا الحديث ابي (كذا) اسحاق بن يسار عن معبد بن كعب بن مالك الانصاري''۔اس کی شرح میں امام سہیلی نے وقت پر اور بعد میں نماز ادا کرنے والے دو طبقات صحابہ کا ذکر کرکے دونوں کے موقف کو صحیح کہا ہے۔حافظ مغلطائی کا اس پر نقد حاکم ہے کہ امام سیرت کی یہ حدیث مرسل ہے اور اسے حاکم نے مستدرک میں موصول و متصل بنایا ہے۔مغلطائی نے اسے حاکم کے بہت سے اوہام میں سے ایک قرار دیا ہے اور حاکم کا بیان بے محل و بے وجہ بتایا ہے،

وہ نہ صرف موصول و متصل ہے بلکہ تدلیس کے الزام سے بھی ان کو بچاتا ہے، حافظ مغلطائی کا جملہ بہت اہم ہے:
"وفیہ دلالۃ علی جلالۃ ابن اسحاق، توقیہ التدلیس، لان معبدا شیخہ، ولم یستجزھنا ان یروی فیہ عالم یسمعہ منہ الا بواسطۃ وھذا غایۃ مایمدح بہ الانسان"۔
(الزہر الباسم، ۴/۱۱۷۷؛ ابن اسحاق/ ابن ہشام/ سہیلی، الروض الانف، مرتبہ مجدی بن منصور، دار الکتب العلمیۃ، بیروت ۲۰۰۹ء، ۳/۴۳۶-۴۳۹؛ سہیلی نے سند ابن اسحاق کے بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ اصلاً وہ مستدرک حاکم کے نقد ابن اسحاق کا رد ہے۔)
متن الزہر الباسم میں سند کی عبارت مختلف ہے: "وقول ابن اسحاق: حدثنی بھذا الحدیث: لایصلین العصر الا فی بنی قریظہ" ابی اسحاق، عن معبد بن کعب بن مالک" محقق کا حاشیہ ہے: "کذا فی المخطوطۃ والسیرۃ النبویۃ المطبوعۃ وھو خلاف لقاعدۃ نحویۃ، والصحیح "ابو" لکونہ فاعلا"........... مگر صاحب حاشیہ و تحقیق نے ابواسحاق بن یسار کی بابت کچھ نہ لکھا اور نہ ارسال کے بارے میں سیرۃ نبویہ مطبوعہ میں ابواسحاق کی ابنیت اور معبد بن کعب بن مالک کی قبائلی نسبت الانصاری کا فرق بھی نہیں ظاہر کیا۔ یہ بحث طلب ہے)۔
امام ابن اسحاق کی تعدیل بلکہ ثقاہت و معتبریت و امامت کا ذکر حافظ مغلطائی نے بہت سے دوسرے مباحث کتاب میں کیا ہے۔ ان میں سیرت نبوی کے سوانح و کوائف اور واقعات و روایات خاص اہمیت رکھتے ہیں اور آگے ان کے حوالے آتے رہیں گے۔ حافظ موصوف نے امام سیرت کے دوسرے سوانحی مباحث، انسابی روایات اور اشعار و شروح کے حوالے سے بھی بحث کی ہے اور ان کی فنی منزلت و تبحر کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کا حوالہ بالعموم امام سہیلی پر ان کی تنقیدات کے ضمن میں آتا ہے یا دوسرے مصادر سے نئی معلومات و اخبار و روایات کے ضمن میں۔

نئی معلومات: حافظ مغلطائی کی کتابِ نقد و استدراک میں ایک اہم ترین زاویہ تحقیق یہ ہے کہ وہ سیرت نبوی سے متعلق بہت سی نئی قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مضامین نو کے انبار عظیم میں سیرت طیبہ کے تمام ادوار۔ قبل بعثت، بعد بعثت: مکی عہد اور مدنی دور کے بارے میں جو جواہر ریزے ملتے ہیں وہ سیرت نگاری کی بہت سی خلاؤں کو پر کرتے ہیں، احوال و شخصیات کے حوالہ سے سوانحی حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں اور سیرت طیبہ کا دائرہ کار کو مزید وسیع کرتے ہیں۔ ان میں سے صرف

چند مثالوں سے ادوار سیرت نبوی کی تابناکی میں عطایائے مغلطائی کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور نئی سیرت نگاری کی جہات میں زیادت اور سیرت نگاروں کے لیے ہدایت کے رہ نما خطوط ملتے ہیں جو ان کی شمولیت و بحث و تمحیص کو لازمہ تحقیق بناتے ہیں۔

خاندان رسالت: جد امجد ہاشم بن عبد مناف بن قصی: کے قریش کو زمانہ قحط میں ''ثرید لحمی'' کھلانے کی روایت ابن اسحاق/ابن ہشام پر علامہ ابوالعباس احمد بن الحسین نبہانی نشوی کی ''کتاب ذم المحتکرین'' کی ایک متصل روایت حضرت ابن عباسؓ سے یہ اضافہ کیا ہے کہ قریش میں کسی کو جب بھکمری (مخمصة) کا سامنا ہوتا تو وہ اپنے عیال کے ساتھ ایک معروف مقام پر استادہ خیمہ میں جا بستا اور وہیں مرجاتا۔ جب ہاشم کا زمانہ آیا تو اس کے اسد نامی فرزند سے اس کے ایک مخزومی ہمعصر نے کھانے کی فراہمی کا تقاضا کیا اور اسد نے اپنی ماں کو روتے ہوئے بتایا اور انھوں نے آٹا اور چکنائی (دقیق و شحم) بھیج کر ان کو چند دنوں تک مزید زندہ رکھا اور زوجہ ہاشم نے اپنے شوہر گرامی کو جب یہ ماجرا کہہ سنایا تو انھوں نے قریشی لوگوں کو بھکمری سے بچانے پر آمادہ کیا اور خود اونٹ ذبح کرکے اپنی زندگی بھر دوسروں کو کھلاتے رہے اور وہ اول شخص تھے جس نے ثرید بنائی اور لاچاروں کی دستگیری کی اور فقیروں کو کھلایا۔ (الزہر الباسم: ۱/۵۲-۵۳، حواشی محقق: ۵-۶: علامہ نشوی کا ترجمہ/خاکہ محقق کو نہ مل سکا مگر انھوں نے قلقشندی کی صبح الاعشی: ۱/۴۹۱ اور طبری، تاریخ: ۱/۵۰۴ کا حوالہ روایت کے باب میں دیا ہے۔ یہ روایت بہرحال قابلِ نقد و تحقیق ہے کیونکہ عرب قبائل بالخصوص قریشی بطون میں مشائخ و سادات قبیلہ اور مخیر حضرات کا عام طریقہ اطعام خیر تھا اور وہ ہاشم کے زمانے سے قبل سے چلا آرہا تھا اور ان کے بعد تک جاری رہا۔ عربی فیاضی و سخاوت کا یہ محکم و مسلم قانون خاکسار کی کتاب عہد نبوی کا تمدن میں باب اطعام اجماعی میں تفصیل سے آیا ہے)۔

عبدالمطلب بن ہاشم کا ایک مادری نسب نامہ مشہور شاعر و خطیب و حنیف سوید بن صامت اوسی سے جاملایا ہے اور وہ یقیناً ایک قیمتی خبر ہے جو نہ صرف خاندانی تعلقات کا ایک نیا باب کھولتی ہے بلکہ سیرت و رسالت محمدی کے باب میں نئی جہات سامنے لاتی ہے۔ مرزبانی کا قول نقل کیا ہے کہ سوید بن صامت اوسی کی والدہ لیلیٰ بنت عمرو خاندان بنی عدی بن نجار کی تھیں اور وہ عبدالمطلب ہاشمی کی خالہ تھیں۔ والدہ عبدالمطلب ہاشمی اور والدہ سوید بن صامت اوسی دونوں سگی بہنیں تھیں۔ ان کی شادیوں

کی کچھ تفصیل بھی دی ہے اور یہ حوالہ عرض قبائل کے مبحث میں ہے۔

(الزہر الباسم: ۲/ ۷۴۳، حواشی محقق میں حاشیہ: ۸-۹ میں ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۳/ ۱۴۷ دیکھنے کا مشورہ دیا گیا ہے، مرزبانی کے بارے میں کچھ نہیں لکھا)۔

عبدالمطلب کے والد کے ایک رویا میں شیبہ الحمد کی خوشخبری اور مجد و شرف مستقبل کی پیش گوئی کی روایت لیکن یہ روایت بہت صحیح نہیں ہے۔ (الزہر الباسم: ۱/ ۳۶۹)

لشکر ابرہہ/ قائد فیل کے فیل و اہل عبدالمطلب کی تعداد و قدر قیمت اور دوسری قیمتی معلومات کا ذکر کیا ہے۔ (۱/ ۲۰۳-۲۰۵)

شاعر جاہلی مطرود بن کعب خزاعی کی حمایت و حفاظت عبدالمطلب ہاشمی، ان کی "جنایت" کے باوجود شاعر ان کا مداح بن گیا۔ (۱/ ۲۱۷ و مابعد)

والد ماجد عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کی سوانح سے متعلق نئی روایات حافظ مغلطائی نے مختلف مصادر سوانحی و ادب سے جمع کی ہیں جیسے (۱) خواب/ رویا میں عبداللہ کو ابو محمد کی کنیت اور ان کے شرف عظیم کی خبر/ خوشخبری ہاتف اور عبدالمطلب کو اس کی اطلاع فرزند اور اس کے بعد ہی آمنہ "سیدہ قریش" سے عبداللہ کی شادی کی بجا آوری۔ یہ المہزمی کے مرتبہ/ جمع کردہ دیوان ابی طالب کی روایت ہے۔

۲۔ واقعہ فیل میں عبداللہ کو عبدالمطلب نے قائد فیل کے حملہ کے منصوبے اور اس کے واقعہ اور فرار فیل و صاحب الفیل کا ایک نیا منظر نامہ بیان کیا ہے۔

۳۔ خواتین قریش کے ایک اجتماع سے حضرت عبداللہ ہاشمی کے گزرنے کے بعد نہ صرف ان کے شمائل بیان کیے بلکہ ان سے زواج کے حسنات و مبرات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ہی ایک اہل تبالہ کی خثعمی خاتون کا واقعہ ہے جو کفو کی تلاش میں مکہ آئی تھی اور اس نے عبداللہ سے شادی کی تجویز رکھی تھی۔ (الزہر الباسم: ۱/ ۳۶۵، یہ ایک بہت قیمتی خبر ہے)

۴۔ وفات وسن کے بارے میں واقدی کی روایت کہ بنوالنجار/ مدینہ کے ہاں وفات پائی بعمر ۲۵ سال اور بقول واقدی: ھذا اثبت الاقاویل (۱/ ۳۸۹، واقدی کا اثبت الاقاویل کا نقدو فیصلہ ان کے نقد و اعتبار کے علاوہ عبداللہ ہاشمی کی مختلف عمروں کی روایات کے ضمن میں بہت اہم ہے)۔

ابولہب عبدالعزیٰ بن عبدالمطلب ہاشمی کی کنیت کے معنی روشن چہرہ کی تردید مغلطائی نے

ایک نقد میں کی ہے اور اس کی دوسری توجیہ کی ہے۔

۲۔عبدالمطلب ہاشمی کے آخر حیات میں ان کے نابینا ہونے کے دوران/ زمانے میں ابولہب کے باپ کی خدمت گزاری کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ طائف سے ان کو ساتھ لانے اور خزاعی قافلہ حجاج کے جبر واسارت سے ابولہب اور عبدالمطلب کے شاعر مطرود کو بچانے اور زر فدیہ ادا کرنے کا واقعہ بیان کیا ہے۔اس واقعہ کی بنا پر شاعر خزاعی نے ان دونوں پدر و فرزند کے احسان و فضل کے عوض قصیدے کہے تھے۔شاعر احسان شناس نے اور بھی فرزندان عبدالمطلب ہاشمی کے محاسن میں قصیدے کہے تھے جو ان کے دیوان میں موجود ہیں اور جن کا حوالہ مغلطائی نے دیا ہے۔

اعمام نبوی: ابوطالب، ابولہب اور عباس وغیرہ کے بارے میں بہت سی روایات متعدد/ مختلف مصادر سیرت و سوانح و ادب سے جمع کر دی ہیں اور ان سے قبل بعثت کے واقعات و اشخاص کے بارے میں بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں جیسے کفالت نبوی کے باب میں حضرت زبیر بن عبدالمطلب کے کردار پر بحث اور حلف الفضول میں ان کی تگ و دو اور تحریک پر معاہدہ تعاون و حفاظت کا انعقاد وغیرہ۔ ایک اور عم مکرم الغیداق کے لقب کی تشریح میں لکھا ہے کہ وہ ان کی ''کثرت عطا'' کے سبب قوم نے ان کو دیا تھا۔ان کو اجود قریش بھی قرار دیا ہے (الزہر الباسم ۱: ۱/۵۸۴؛ حواشی محقق، نیز الزہر الباسم: ۳۱۳۔۳۱۵ وغیرہ)۔ان اکابر و اولاد قصی بن کلاب وغیرہ کے حوالہ سے جاہلی دور میں کتابت (لکھنے پڑھنے کے فن) پر کچھ نئی اور قیمتی خبریں دی ہیں یا اسی قسم کے دوسرے تہذیبی و سماجی احوال سے تعرض کیا ہے۔

واقعاتِ سیرت نبوی۔قبل بعثت: سیرت نبوی کے واقعات و حوادث اور ان کی احادیث و روایات بعثت سے قبل زمانے سے متعلق اجداد و اکابر نبوی کے ضمن میں گزر چکی ہیں۔اس خاص عنوان کے تحت صرف ان روایاتِ مغلطائی کا ذکر کیا جائے گا جو ذات رسالت مآب ﷺ سے متعلق ہیں اور نئی ہیں۔وہ ان کے خاص مصادر کی ہیں۔ان منتشر و پراگندہ روایات کو جمع کر کے مغلطائی نے نئی معلومات یا معلومات کے نئے زاویے پیش کیے ہیں۔ان کی تعبیرات بھی بسا اوقات اہم ہوتی ہیں خواہ وہ الفاظ و اصطلاحات روایات سیرت سے متعلق ہوں یا احادیث نبوی اور آیات کریمہ سے مربوط۔ موخر الذکر دونوں کا الگ الگ عناوین کے تحت ذکر آتا ہے۔

لدۃ، تراب کا فرق معانی: رسول اکرم ﷺ کی ولادت اور اس کے معجزات و کرامات کی

روایات کے ضمن میں معاصر شخصیات کی روایات بہت اہم روایتی عنصر کی حامل ہیں جیسے لدۃ اور تراب/ ترب کی بحث حضرت قیس میں مخرمہ نوفلیؓ کی روایت: ''ولدت انا ورسول اللہ ﷺ عام الفیل فنحن لدان''۔ ابوذر خشنی کی الاملاء المختصر کے حوالہ سے یہ صراحت کی ہے کہ لفظ ''لدتان'' لدان کی بجائے، کہا جاتا ہے کہ ''فلان لدۃ فلان'' جب وہ دونوں ایک وقت ہی پیدا ہوئے ہوں۔ حافظ مغلطائی کی تشریح ہے ''اللدۃ تقال للرجال والاتراب للنساء'' یعنی لدۃ مردوں کے لیے اور اتراب عورتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ معظم اللغویین'' (اکثر لغت نویسوں کا قول ہے) (الزہر الباسم: ۳۹۰، حواشی محقق کے آخر الذکر میں ابن منظور کی لسان العرب کا حوالہ ہے، عام طور سے سیرت نگار اس کا ترجمہ ''ہم سن'' کر دیتے ہیں جو مختلف ہے)۔

محمد نامی اکابر جاہلی: حافظ مغلطائی نے حضرت محمد بن عبداللہ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت و تسمیہ سے قبل متعدد اکابر جاہلی کے تسمیہ محمد کی روایات بہت سے مصادر سے جمع کی ہیں۔ ان میں شامل ہیں: سہیلی کی اس روایت پر کہ آپ سے قبل تین اشخاص محمد نامی تھے نقد سے بحث شروع کی ہے اور ان کی غلطی کا سبب ابن خالویہ کی کتاب کی بلا نقد و کورانہ تقلید قرار دے کر دوسرے مصادر کا ذکر کیا ہے جیسے بغدادی کی کتاب المحبر، ابن سعد کی کتاب الطبقات، الفجع کی کتاب المنقذ، ابن درید (الاشتقاق)، دلائل ابی نعیم، خرائطی کی کتاب ہواتف الجنان، ابن دحیہ۔ ان سب پر تو نہیں بلکہ بیشتر پر نقد ہے کہ یہ غلط خیال ہے (الزہر الباسم، ۳۶۷۔۳۷۷، حواشی محقق میں مصادر کی تخریج و تعیین کے علاوہ فتح الباری کے مباحث کا حوالہ بھی ہے؛ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل کسی بھی جاہلی شخص کے محمد نام سے تسمیہ کی تمام روایات روایتی اور درایتی دونوں لحاظ سے غیر معتبر ہیں۔ اس پر ایک تحقیقی بحث کی ضرورت ہے)۔

مولد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: ولادت نبوی کے زمانے۔ عام الفیل۔ وغیرہ مختلف حوادث کے درمیان زمانی فروق اور خاص مولد نبوی کی تواریخ کے اختلافات شدید کی تمام روایات جمع کر دی ہیں اور وہ حافظ موصوف کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے اور اس کا اثر ان کی کتاب مختصر ''الاشارہ'' میں بھی ملتا ہے۔ فیل اور مولد کے درمیان دس سال (ابن عساکر)، پانچ سال قبل فیل (خلیفہ بن خیاط)، فیل کے پندرہ سال بعد (کلبی)، فیل کے ایک ماہ بعد (الرشاطی) دوشنبہ ۱۲ ربیع الاول یوم الفیل (ابوحاتم/ کتاب السیر) حاکم کا یوم الفیل پر استدراک، واقعہ فیل کے ۵۵ ایام کے بعد (ابن سعد) قصہ فیل سے ستر سال قبل

(تفسیر ابن عباس)، چالیس سال قبل/ بعثت سے اسی سال قبل (تفسیر مقاتل)۔ پھر دوسرے بیانات و اختلافات کے بعد تاریخ پر اختلاف ہے، ربیع الاول کی ۲، ۲۴/ (ابن عبدالبر)، ۸ (خوارزمی) وغیرہ ربیع الاول کا اولین دوشنبہ (طبری)، ابونعیم، اوائل (ہلال عسکری) ابن الاثیر وغیرہ سے متعدد اختلافی تواریخ ماہ کے علاوہ محرم/ عاشورا، رمضان کے ماہ کا بھی حوالہ ہے۔ محاکمہ مغلطائی ندارد ہے۔ (الزہرالباسم:۱/ ۳۸۰-۳۸۸، حواشی محقق میں مصادر و مراجع کے حوالے ہیں۔ ولادت نبوی سے متعلق روایات و مباحث کافی دور تک گئے ہیں: ۳۸۸)۔

رضاعتِ حلیمہ سعدیہؓ: حافظ مغلطائی نے اس موضوع کے تحت عبدالمطلب، حلیمہ اور شیماء کے اشعار (لوری)، وفات عبداللہ پر آمنہ کا مرثیہ (اشعار سمیت) اور نقد سہیلی کے ضمن میں کافی اشعار اوران کی شرح کرنے کے علاوہ خاص روایات وواقعات رضاعت وعرصہ رضاعت میں ذکر کیا ہے۔

۱۔ بی بی آمنہ کی قصور بصریٰ، نور نبوی وغیرہ کے بارے میں معجزاتی روایات۔

۲۔ قصہ شق صدر: صحیح الاسناد والاتصال مختلف صحابہ کرام سے ثقہ علماء کی روایات/ صحیح بخاری وغیرہ۔ ایسی احادیث کی تعداد ہے: ۱۴ اور اس سے زیادہ مصادر ہیں۔

۳۔ اسلام حلیمہ پر امام مغلطائی کا رسالہ ''التحفة الجسیمة فی ذکر حلیمة'' جس میں ان کے عدم اسلام کے اقوال پر رد ہے، التحفة الجسیمة فی اسلام حلیمة (کا عنوان پہلے آیا ہے)۔

۴۔ بعض دوسرے واقعات رضاعت و پرورش۔

(الزہرالباسم، ۱/ ۳۹۱-۴۰۶، حواشی محقق، محاکمہ روایات نہیں ہے لیکن نئی معلومات کافی ملتی ہیں۔ حضرت حلیمہؓ وثویبہؓ کا ذکر آگے بھی ہے: ۱/ ۴۱۱-۴۲۰ ومابعد، شبلی: ۱/ ۱۷۴ نے مغلطائی کے اس رسالہ کا ذکر زرقانی کے حوالہ سے کیا ہے۔ وہ رسالہ اب چھپ گیا ہے اور اس کا ذکر محقق وحواشی نے اپنی بحث حافظ میں کیا ہے)۔

وجوب نبوت محمدی: قول سہیلی: ''وآدم بین الروح والجسد'' سے نقد واستدراک شروع کر کے بہت سے مصادر حدیث وسیرت وغیرہ سے تمام احادیث کو جمع کر دیا ہے، اوران کے معانی وتعبیرات اور شروح کی ہیں۔ یہ ایک عمدہ بحث ہے اور اس میں احادیث وروایات پر نقد مغلطائی بھی ملتا ہے۔

(الزہرالباسم: ۴۰۶-۴۱۰، حواشی محقق)

وفات ومقام تدفین والدہ ماجدہ: مصادر کثیرہ جیسے بغدادی کی کتاب المحبر، ابن عبدالبر/ الاستیعاب، ابن الجوزی/ التلقیح، عبدالغنی/ سیرت النبی، ابونعیم، ابن کثیر، ابن اثیر، ابوالحسن محمد...... بن البراء کی معالم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، کتاب ابی جعفر طبری وغیرہ اور مختلف احادیث سے ان تمام امور کا ذکر مع اشعار کیا ہے۔ اس کے بعد شق صدر کی مختلف احادیث متعدد مصادر سے پھر نقل کرکے ان سے بحث کی ہے۔ (الزہر الباسم ۴۱۱-۴۱۹، حواشی محقق، اس کے بعد مختلف الفاظ وکلمات کی لغوی تشریحات بہت تفصیل سے کئی صفحات میں نقل کی ہیں)۔

خاتم النبوۃ: شکل وصورت، خاتم نبوت کا وقت، شق/شرح صدر بحوالہ سورۃ الانشراح، متعدد مصادر سے نقل کیا ہے جو خاصہ کی چیز ہے۔ (الزہر الباسم، ۴۳۸-۴۴۰، حواشی محقق)

اولین سفر شام و واقعہ/قصہ بحیرا راہب: عمر نبوی، اسم بحیرا وغیرہ، ابوبکرؓ و بلالؓ کی معیت و رفاقت (نقد مغلطائی)، سفر کے اشعار ابی طالب وغیرہ پر خاصی روایات کا احاطہ کیا ہے، بلا نقد بحث ہے۔ (الزہر الباسم: ۴۴۱-۴۴۵، حواشی محقق)

جنگ فجار کے بارے میں سہیلی کے ذکر کردہ چار ایام پر پانچویں یوم نخلہ کا اضافہ کرکے مزید ایام کا حوالہ دوسرے مصادر سے دیا ہے۔ (۱/۴۴۹-۴۵۳)

زواجِ خدیجہ پر ایک کافی مفصل بحث ہے جس میں روایات واحادیث کے جمع کرنے کے ساتھ کلام ونقد سہیلی بھی ہے۔ (۱/۴۵۴-۴۶۱)

اس میں کلمہ خدیجہ کی لغوی تحقیق دل چسپ ہے اور خدیجہؓ کے سابق شوہر زرارہ بن النباش کی نسبت اسیدی پر بھی مختصر کلام ہے۔ حضرت ورقہؓ بن نوفل، فرزند قاسمؓ وغیرہ کے بارے میں مغلطائی نے کافی نئی روایات جمع کردی ہیں۔ (۱/۴۶۲-۴۷۵)

بناء الکعبہ کی بحث میں مصادر سیرت: موسیٰ ابن عقبہ، ابن اسحاق، ابن سعد، واقدی، تاریخ ابن خیثمہ، ابومعشر، مسعودی وغیرہ کی روایات تنصیب حجر اسود کے بارے میں نقل کی ہیں، (۱/۴۷۴-۴۷۷ حواشی محقق، آخر میں قصی کی تعمیر کعبہ کا ذکر ہے۔ دو شعر میں اوران کی شرح سہیلی پر نقد مغلطائی ہے۔)

(باقی)

کلام صوفیہ کی رمزیت اور معنی آفرینی

☆ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی

تصوف ایک ذوقی اور وجدانی علم ہے۔صوفیہ کرام راہ سلوک میں مختلف تجربات سے دو چار ہوتے ہیں۔مختلف مقامات سے گزرتے ہیں،ان پر مختلف واردات اور کیفیات طاری ہوتی ہیں۔یہ واردات و کیفیات اور احوال و مقامات ایک ایسی دنیا یا دنیاؤں کے ہوتے ہیں جس کو یا جن کو اشاراتی زبان میں لامکانی اور لازمانی دنیا کہا جاتا ہے۔وہ دنیا اس عالم رنگ و بو سے ماوراء ہوتی ہے۔وہ عالم اس دنیائے کون و مکان سے بلند ہوتا ہے اس پر دنیا یا عالم کا اطلاق محض زبان کے عجز کا اظہار اور زبان کی محدودیت کا شکوہ ہے،بعض صوفیہ کے نزدیک وہ دنیا لامکانی و لازمانی تو نہیں ہوتی لیکن کثرت موہوم کے فروق و امتیازات اس دنیا میں نہیں ہوتے وہ ایک دائرۂ وحدت کی دنیا ہوتی ہے۔عالم کثرت کی پروردہ زبان اس وحدت نظارہ کے بیان سے قاصر ہوتی ہے۔صوفیہ کرام کے تجربات چوں کہ ذوقی ہوتے ہیں اس لیے یہ دونوں باتیں درست ہوسکتی ہیں اور مختلف صوفیہ کے تجربات مختلف ہوسکتے ہیں۔ صوفیہ کرام اپنے سفر سلوک میں اس دنیا میں پہنچتے ہیں جہاں وقت کا حجاب اٹھ جاتا ہے،جہاں مکان کی قید ختم ہو جاتی ہے جہاں گفتگو حرف وصوت کی محتاج نہیں ہوتی اور معنی کو لفظ کے لباس کی احتیاج نہیں ہوتی۔لیکن جب وہ اس دنیا سے واپس آتے ہیں (یہ ذہاب اور ایاب وقت کا محتاج نہیں ہوتا) تو اس دنیا کے مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے صوفیہ کے پاس صرف وہی زبان ہوتی ہے جو وقت اور مکان کی دنیا میں پابند اسی عالم رنگ و بو میں وضع کی گئی ہے جس کا مقصد صرف اس عالم آب و گل میں ترسیل و ابلاغ ہے اور اس زبان کا یہ عالم ہے کہ یہ زبان خود اس عالم کون و فساد کے حقائق کو بھی پوری طرح آشکار نہیں کر پاتی،چہ جائیکہ اس میں اس عالم کے حقائق بیان کیے جائیں جہاں یہ زبان صرف

☆اسسٹینٹ پروفیسر،ڈپارٹمنٹ اسلامک اسٹڈیز،جامعہ ملیہ اسلامیہ،نئی دہلی۔

زبانِ بے زبانی ہے۔اس عالم کے حقائق کو اس ملفوظی زبان میں ادا کرنا مشکل ہے۔ایک بات واضح رہے کہ صوفیہ کا یہ سفر حقیقی معنوں میں کسی موجود یا خارجی چیز کا سفر نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کی دروں بینی اور ایک طرح کا ذہنی سفر ہے۔جس کا اثبات بعض صوفیہ نے واضح الفاظ میں کیا ہے۔اس سفر میں وہ جن مشاہدات اور تجربات سے دوچار ہوتے ہیں وہ مشاہدات اور مرئیات اور تجلیات اتنی مسحور کن اور خیرہ کردینے والی ہوتی ہیں کہ اس سے دوچار ہونے والا شخص اس میں مبہوت اور ششدر رہ جاتا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے اس کا مشاہدہ وسیع ہوتا ہے اور ان لامکانی حقائق کا ادراک جتنا زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ ختم ہونے لگتے ہیں بلکہ الفاظ کے اشارے اتنے ہی تنگ ہوتے جاتے ہیں کہ وہاں زبان ترسیل کا ذریعہ نہیں رہ پاتی کہ نفری نے کہا ہے، کلما اتسعت الرؤیۃ ضاقت العبارۃ۔ (یعنی مشاہدہ جتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے الفاظ کی قبا اتنی ہی تنگ ہو جاتی ہے۔): ۱۔یہ مشاہدات اتنے ماورائی ہوتے ہیں کہ اس مقام پر عبارت حجاب بن جاتی ہے۔ ۲۔اور اپنی حجابیت میں علم و جہل دونوں ہی دیدار کے لیے حجاب کا کام کرتے ہیں ۳۔اور نفری نے ہی ایک دوسرے موقع پر یہ عبارت نقل کی ہے ”الحرف یعجز ان یخبر عن نفسہ فکیف یخبر عنی“ (لفظ تو درماندہ ہے کہ اپنے ہی معنی بیان کرسکے وہ میرے بارے میں کیا اطلاع دے سکتا ہے)۔(۴)

زبان کی ان تنگنائیوں کے باوجود ان مراحل سے دوچار ہونے والوں کے سامنے اور کوئی راستہ بھی نہیں کہ وہ وہی زبان استعمال کریں جسے وہ جانتے ہیں اور جسے دوسرے سمجھتے ہیں۔اس لیے وہ لامکاں اور لازماں کے حقائق کو زمان و مکان کی اس وصفی اور ملفوظی زبان میں بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔یعنی حسیات سے بلند دنیا کی واردات کو عالم محسوسات کے لیے تشکیل دی گئی زبان میں بیان کرتے ہیں اس لیے ان کی گفتگو مرموز اور بسا اوقات غیر واضح ہو جاتی ہے۔عام قاری اس عبارت کا کوئی حتمی مفہوم متعین نہیں کر پاتا یا کہنے والے کی مراد کے برخلاف معنی اخذ کرتا ہے اور بسا اوقات محض اس زبان کو صحیح محمل میں نہ رکھنے کی وجہ سے صوفیہ کرام مطعون بھی ہوتے رہے ہیں اور ان پر طرح طرح کے الزامات بھی عائد کیے جاتے رہے ہیں۔

دراصل صوفیہ جن کیفیات سے دوچار ہوتے ہیں ان کو صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس جہاں سے آشنا ہیں جس کے وہ حقائق ہیں وہاں اول تو کوئی زبان ہی نہیں چونکہ زبان تو مخفی چیزوں کے

بارے میں شرح کا کام کرتی ہے اور وہاں تو ہر چیز آئینہ ہے۔ اگر ان مشاہدات کے لیے کوئی متعین زبان ہوگی بھی تو اس سے یہ سالکین واقف نہیں ہوتے۔ اس لیے وہاں کے حقائق کو بیان کرنے کے لیے کسی بھی ظاہری یا باطنی مشابہت یا مماثلت کے شائبہ کی بنیاد پر اس عالم رنگ و بو کا کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں وہ لفظ ان کی مراد نہیں ہوتا بلکہ مراد کے لیے صرف اشارہ یا تمثیل ہوتی ہے۔ ان کی مراد کو سمجھنا اور ان کے کلام کو محمل حسن پر اتارنا ضروری ہے۔

صوفیہ کو خود بھی ہمیشہ اس کا احساس رہا کہ جو الفاظ وہ استعمال کرتے ہیں ان الفاظ کے قالب ان معنی کے متحمل نہیں ہیں جو وہ مراد لیتے ہیں۔ اس لیے صوفیہ دراصل لفظ کے ذریعے اس کے معنی مراد نہیں لیتے بلکہ معنی کے معنی مراد لیتے ہیں کہ لفظ جس حقیقت کی کشود کرتا ہے وہ حقیقت مطلوب نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت تو اس کے درون میں مخفی ہے اور اس تک رسائی کے لیے لفظ صرف ایک وسیلہ یا اشارہ کا کام کرتا ہے۔ اس حقیقت کو عیاں دیکھنے کے لیے لفظ کی قبا کو چاک کر کے بطون معنی میں مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس لیے بعض صوفیہ نے یہ دعوت دی ہے کہ پیکر ملفوظات کی وادی سے گزر کر ہی وہ علم حاصل ہوتا ہے جو مکمل طور پر کامل ہے۔ جہاں یکتائیت ہے حق کی بھی اور ہر چیز کی۔ وہ کائنات ایسی ہے جس کا امتیاز یکتائی ہے، وحدت ہے، فرق و امتیاز سے بلندی ہے۔ جبکہ ہماری یہ دنیا یا کائنات زوج زوج ہے۔ یہاں علم کے ساتھ جہالت اور عدل کے ساتھ ظلم وابستہ ہے۔ اور اس تضاد کے ذریعے ہی ہم معانی کا تعین کرتے ہیں اس لیے اس کے حرفی پیکر بھی اسی طرح کے متضاد صفات کے حامل معانی پر دلالت کرتے ہیں جب کہ صوفیہ کے تجربات اس سے ماوراء ہوجاتے ہیں۔

صوفیائے کرام کی گفتگو مرموز تھی۔ عام آدمی کے لیے اس کا فہم مشکل تھا۔ اس لیے ان کے اس کلام کو اشارہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، خود صوفیہ بھی اس کو اشارات ہی کہتے ہیں، ابو علی روذباری نے فرمایا کہ "ہمارا یہ علم محض اشارات ہیں، اگر ان کو ملفوظی زبان کا جامہ پہنایا جائے تو ان کا مفہوم مخفی ہو جاتا ہے۔" (۵) اس کا مطلب یہی ہے کہ ان حقائق کو برہنہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا چونکہ وہ حقائق ملفوظی زبان کی قید سے بلند ہیں۔ ابو بکر کلاباذی نے اس لیے ان علوم کو علوم خواطر اور علوم مشاہدات اور مکاشفات کہا ہے اور لکھا ہے اسے علم اشارہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ دلوں کے مشاہدات اور باطنی کیفیات کی تشریح تحقیقی طور پر نہیں ہوسکتی۔ اس کی طرف اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے۔ (۶)

تصوف کے اولین شارح اور مصنف ابونصر السراج نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اللمع فی التصوف میں لفظ اشارہ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اشارہ کا مطلب ہے کہ متکلم خود تو اس بات سے آگاہ ہو لیکن اس بات کے لطیف ہونے کی وجہ سے وہ اس کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکے۔(۷) اشارہ کے مترادف ایک اور لفظ متقدمین صوفیہ کی اصطلاحات میں استعمال ہوا ہے اور وہ ہے رمز، رمز و اشارہ کو بعض صوفیہ نے الگ الگ بھی بیان کیا ہے اور بعض نے مترادف معنی میں رکھا ہے لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ قریب قریب مترادف ہی ہیں۔ ابونصر السراج نے رمز کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے ''ظاہری الفاظ کے تحت ایسے باطنی معنی رکھ دینا جسے صرف رمز شناس صوفیہ ہی سمجھ سکیں، کوئی دوسرا نہ سمجھ سکے'' (۸) اور اسی طرح کی بات اشارہ کے بارے میں کہی ہے جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔

صوفیہ کی اس مرموز گفتگو کا ادراک اس دور کے دیگر اہل علم کو بھی تھا اور وہ محسوس کرتے تھے کہ صوفیہ جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں وہ عسیر الفہم ہے۔ عام انسان پر اس کا مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوتا، ان میں سے کچھ لوگوں نے اس زبان پر اعتراضات بھی کیے، مثلاً ایک مشہور صوفی ابوالعباس ابن عطا سے کسی نے خاص اس زبان کے بارے میں سوال کیا کہ ''صوفیو! تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ تم نے یہ کیسے الفاظ وضع کر لیے ہیں جو عام لوگوں کے لیے غیر مانوس ہیں اور عام رائج الوقت زبان کو ترک کر کے تم نے نامانوس زبان استعمال کرنی شروع کر دی ہے۔ ایسا تم کیوں کرتے ہو؟ کیا حقائق کی پردہ پوشی کے لیے یا اپنے مسلک کے عیوب پر پردہ ڈالنے کے لیے؟''

ابوالعباس نے جواب دیا ''چونکہ ہمارے نزدیک یہ علم ایک نایاب علم ہے اس لیے ہم نے غیرت کھاتے ہوئے ایسا کیا ہے تاکہ ہماری جماعت کے سوا کوئی اور اس کا مزا نہ چکھ سکے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ اشعار کہے:

اَحۡسَنُ مَا اَظۡهَرَهٗ وَ نُظۡهِرُهٗ   بَادِیۡ حَقٍّ لِلۡقُلُوبِ نَشۡعُرُهٗ

کیا ہی عمدہ بات ہے جسے اللہ نے ظاہر کیا اور ہم نے بھی ظاہر کیا اور وہ حق تعالیٰ کی طرف سے ظاہر ہونے والے امور ہیں جنھیں ہم دلوں پر واضح کر دیتے ہیں۔

یُخۡبِرُنِی عَنِّیۡ وَعَنۡهُ اُخۡبِرُهٗ   اَكۡسُوۡهُ مِنۡ رَوۡنقه مَا يَسۡتُرُهٗ

اللہ مجھے میری حقیقت بتا دیتا ہے اور میں اسے اس کے متعلق خبر دیتا ہوں اور میں اس کو ایسی

آب وتاب پہناتا ہوں کہ

عَنۡ جَاهِلٍ لَا يَسۡتطِيۡعُ ينشره يُفۡسِدُ مَعۡنَاهٗ اِذَا مَا يَعۡبُرُهٗ

اس کی وجہ سے وہ ایسے جاہل لوگوں سے پوشیدہ ہوجاتا ہے جو نہ اسے ظاہر کر سکتے ہیں اور اگر بیان کرنا چاہیں تو اس کا مفہوم بگاڑ دیتے ہیں۔

فلا يطيق اللفظ بل لا يعشره ثم يوافى غيره فيخبره

چنانچہ وہ ایک لفظ بھی کہنے کی طاقت نہیں رکھتا بلکہ اس کا دسواں حصہ بھی نہیں کہہ سکتا پھر اوروں کے پاس جاتا ہے جو اسے بتاتے ہیں۔

فَيُظۡهِرُ الجَهۡلَ وَيَبۡدُوۡ رَمزهٗ وَيَدۡرُسُ العِلم وَيَعۡفُوۡ اَثَرُهٗ

اس طرح وہ جہالت کا اظہار کرتا ہے جس سے اس کے رمز کا وجود ظاہر ہوجاتا ہے۔علم مٹ جاتا ہے اور اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔

اور انھوں نے یہ اشعار بھی پیش کیے:

اِذَا اَهۡلَ العِبَارَةِ سَائَلُوۡنَا اَجَبۡنَا هُمۡ بِاَعۡلَامِ الاِشَارَهٗ

جب اہل عبارت ہم سے سوال کرتے ہیں تو ہم ان کو اشاروں سے جواب دیتے ہیں۔

نُشِيۡرُبِهَا فَنَجۡعَلُهَا غُمُوۡضًا تَقۡصُرُ عنه تَرۡجَمَةُ العِبَارَةُ

ہم ان رموز سے اشارہ کرکے (معانی کو) مشکل بنادیتے ہیں جس کی وضاحت کرنے سے اس عبارت کا ترجمہ بھی عاجز ہوتا ہے۔

ونَشۡهَدُ هَا و تَشۡهَدُنَا سُرُوۡراً لَهٗ فِيۡ كُلّ جَارِحَةٍ اِشاره

ہم اسے دیکھتے ہیں اور وہ ہمیں خوش ہوکر دیکھتا ہے اور اس کا ہر عضو اس سرور کو برانگیختہ کررہا ہوتا ہے۔

تَرَى الاَقۡوَالَ فِي الاَحوال اَسۡرىَ كَاَسۡرِ العَارِفِيۡنَ ذوى الخَسَارَةُ

تو دیکھے گا کہ اقوال احوال کے اسی طرح قیدی بنے ہوئے ہیں جس طرح عارفین اہل خسارہ لوگوں کو قید کرلیتے ہیں۔(۹)

صوفیہ کے رمزواشارے ریاضی کی طرح بے رنگ وکیف نہیں ہوتے بلکہ معنی کے اظہار میں

اپنی محدودیت کے باوجود وہ نہایت لطیف پیرایہ ہوتا ہے اور الفاظ وعبارت نہایت خوبصورت ہوتی ہے۔ایسی خوبصورت اور دلکش عبارت میں یہ لطائف بیان کیے جاتے ہیں کہ سننے یا پڑھنے والا بھی مبہوت ہوکر رہ جاتا ہے۔ایک عظیم صوفی نقاد نے صوفیہ کے رموز واشارات کی خوبی اس شعر میں بیان کی ہے:(۱۰)

اذا نطقوا اعجزك مر می رموزهم　　　وان سكتوا هيهات منك اتصاله

''جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کے اسرا کی حقیقی گرہ کھلتی نہیں اور اگر وہ چپ ہوجائیں تو اس کا وصال ناممکن ہوجاتا ہے۔''

صوفیہ نے اپنے ان اشارات ورموز کا انکشاف صرف اپنے حلقے میں کیا ہے۔چنانچہ ابتدائی عہد کے صوفیہ اپنے اشارات یا تو اپنی محفلوں میں بیان کرتے تھے یا صرف اپنے خطوط میں لکھا کرتے تھے۔نہ انھوں نے ان کا اظہار عوام میں کیا اور نہ اپنی تصنیفات میں۔ابوالنصر السراج نے لکھا ہے کہ ''جب کوئی شخص ہمارے مشائخ کے رموز سے واقف ہونا چاہے اسے ان کے مکاتبات اور مراسلات کا مطالعہ کرنا چاہیے، کیونکہ ان کے رموز ان مکاتبات ومراسلات ہی میں پائے جاتے ہیں، ان کی تصنیفات میں نہیں۔''(۱۱)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ صوفیہ کے یہ باہمی مکاتبات عام لوگوں کے ہاتھ لگ گئے اور ان لوگوں نے ان اشارات کو نہ سمجھنے کی بنیاد پر ان کے خلاف طوفان کھڑا کردیا۔حضرت جنید بغدادی بہت بڑے صوفی تھے۔عام طور پر علما ومحدثین بھی ان کا احترام کرتے تھے۔انھوں نے اصفہان میں اپنے کسی دوست کو خط لکھا۔وہ خط کسی نے راستہ میں کھول لیا اور اس کی نقل پورے شہر میں تقسیم کردی۔اس کے بعد حضرت جنید بغدادی پر لوگوں نے طعن وتشنیع شروع کی جس کی وجہ سے خود حضرت جنید بہت پریشان ہوئے اور اس کے اثرات کو زائل ہونے میں ایک عرصہ لگ گیا۔حضرت جنید نے ایک خط میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مجھے تمھارے خط کا جواب لکھنے سے صرف اس بات نے روکا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے خط کا مضمون تمہاری لاعلمی سے کسی اور کے ہاتھ لگ جائے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت ہوئی کہ میں نے اصفہان کے کچھ لوگوں کو ایک خط لکھا تھا، کسی نے اسے کھول کر اس کی نقل لے لی۔اس خط کی بعض

باتیں کچھ لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکیں اور میں انھیں اس الجھن سے نکالتے نکالتے تھک گیا۔ مجھے اس سے ان کی خاطر بہت رنج اٹھانا پڑا۔"(۱۲)

صوفیہ کرام شروع میں ان لطائف واشارات کو عوام کی نظروں سے چھپانے کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ صرف اصحاب حال کے سامنے ہی زبان کھولتے تھے یا ارباب قلوب کو خطوط کے ذریعہ بتاتے تھے۔ ابوبکر شبلی دسویں صدی کے ایک عظیم صوفی ہیں۔ اگرچہ وہ تصوف کے طریقہ صحو کے پیروکار تھے لیکن ان پر احوال و واردات کا نزول بہت زیادہ تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی کو ایک خط لکھا۔ اس میں اپنے واردات کا اظہار کھلے الفاظ میں کیا تھا۔ یہ خط اللمع فی التصوف میں موجود ہے۔ حضرت جنید بغدادی پر یہ خط بہت شاق گزرا۔ یہ خط ان کے پاس بدھ کے روز آیا تھا۔ انھوں نے ایک ہفتہ تک اسے اپنے پاس رکھا پھر اس کا جواب لکھا کہ:

"اے ابوبکر! مخلوق کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ ہماری تو یہ حالت ہوتی تھی کہ ایک کلمہ کو لیتے پھر اسے سونگھتے اور اس کی تعریف کرتے اور تہہ خانوں میں گھس کر اس کلمہ کو بولتے تھے اور تمہارا حال یہ ہے کہ اکابر خلق کے سامنے بے لگام ہو گئے ہو۔ مخلوق کے ہزار درجے ہیں اور جو کچھ آپ نے لکھا ہے وہ تو پہلے درجے کے لیے بھی مشکل بات ہے۔"(۱۳)

اکابر صوفیہ اپنے ان اشارات کو اس لیے نہیں چھپاتے تھے کہ ان کے اشارات کسی خرابی یا کفر و زندقہ پر مبنی تھے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ عوام ان الفاظ کو صحیح طرح نہ سمجھ پانے کی وجہ سے کسی تشویش میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ یہ دراصل مخلوق پر شفقت کی وجہ سے تھا۔ حضرت جنید بغدادی نے اوپر کے خط میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایک اور خط میں لکھا ہے

"مخلوق کے ساتھ نرمی اختیار کرنی چاہیے، ان کے سامنے ایسی باتیں لانا جنھیں وہ جانتے ہی نہیں، ان پر مہربانی نہیں کہلائے گی اور نہ ہی ان کو ایسے کلام سے خطاب کرنا چاہیے جسے وہ سمجھ ہی نہ سکیں۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے اور تم کو اور ہم کو اپنی حفاظت میں رکھے۔ تم اپنی زبان قابو میں رکھو اور اپنے زمانے کے لوگوں کو پہچانو۔ لوگوں سے ایسی بات کرو جنھیں وہ جانتے ہوں اور جن امور کو وہ نہیں جانتے انھیں ترک کر دو۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ لوگ جن چیزوں سے ناواقف ہوتے ہیں ان کی مخالفت کرتے ہیں، لہٰذا تمہارا عمل ایسا ہونا چاہیے کہ اوروں کے لیے رحمت ہو نہ کہ زحمت۔ اگر خدا نے

تجھے تیری ذات کے لیے مصیبت بنا رکھا ہے تو تجھے چاہیے کہ تو جب مخلوق کے پاس جائے تو اپنی اس حالت کو ترک کر کے صحیح حالت میں ان کے پاس جائے اور ان کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے ان سے گفتگو کرے۔"(۱۴)

صوفیہ کے اس نئی لفظیات کو استعمال کرنے کی امام قشیری نے ایک اور تاویل کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ صوفیہ نے اپنے لیے مخصوص اصطلاحات اس لیے وضع کیں تا کہ ان کے علوم و معارف صرف انہی کے درمیان رہیں اور دوسرے لوگ ان کے صحیح مفہوم سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ انھوں نے اپنی کتاب الرسالۃ القشیریہ میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے "باب فی تفسیر الالفاظ تدور بین ھذہ الطائفہ و بیان ما یشکل منھا"۔(۱۵)

ابوبکر الکلاباذی نے بھی اس سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔ لکھا ہے کہ:

جب حالات ایسے ہو گئے تو صوفیہ کرام نے اپنے علم کے لیے اصطلاحات وضع کر لیں اور ان کو اپنے علم کے لیے اشارہ بنا لیا جو اس علم سے واقف ہوتا وہ ان کو سمجھ لیتا اور جو واقف نہ ہوتا اس سے وہ علوم مخفی رہتے۔(۱۶)

ابتدائی عہد کے اجلہ صوفیہ کے بعد تصوف میں بھی با قاعدہ تصنیف و تالیف کا آغاز ہو گیا تھا اور بعض علما نے پورے فن تصوف پر شرح و بسط کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ سب سے پہلی باضابطہ کتاب ابونصر السراج کی اللمع فی التصوف، پھر ابوبکر کلاباذی کی التعرف لمذھب اھل التصوف اور اس کے بعد کی کتابوں میں امام قشیری کی الرسالۃ القشیریہ، ابوعبدالرحمن السلمی کی طبقات الصوفیہ اور ابونعیم اصفہانی کی حلیۃ الاولیاء خاص طور پر اہم ہیں، اس عہد کے صوفیہ زیادہ مستقیم الاحوال تھے۔ ان کے یہاں ان مشاہدات کا اظہار کم ہے۔ اس لیے مذکورہ بالا کتابوں میں اصطلاحات اور فنی انفرادیت تو ملتی ہے اشاراتی اور رمزیہ گفتگو کم ملتی ہے۔ تصوف کی اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ صوفیہ کی اشاراتی زبان میں گفتگو کا با قاعدہ آغاز ذوالنون مصری نے کیا تھا۔ علامہ جامی نے لکھا ہے کہ ذوالنون مصری سے پہلے کے مشائخ نے ان واردات کا زبان سے اظہار نہیں کیا، سب سے پہلے ذوالنون مصری نے ان کا اظہار کیا۔ ان کے بعد حضرت جنید بغدادی کا زمانہ آیا تو انھوں نے واردات کو لکھنا شروع کیا اور پھر ابوبکر شبلی کا زمانہ آیا تو انھوں نے برسر منبر ان کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔(۱۷)

ذوالنون مصری نے ایک جگہ اپنی ان واردات کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ میں نے راہ سلوک میں یعنی روحانی طور پر تین سفر کیے اور ان تین اسفار میں تین علوم مجھے حاصل ہوئے۔ پہلے سفر میں میں نے جو علم حاصل کیا اس کو خاص و عام سب نے قبول کیا۔ دوسرے سفر میں جو علم حاصل کیا اس کو خواص نے تو قبول کیا لیکن عوام نے قبول نہیں کیا۔ تیسرے سفر میں جو علم حاصل کیا اس کو نہ عوام نے قبول کیا اور نہ خواص نے۔ پہلا علم توبہ کا علم تھا۔ اس کو خاص و عام دونوں نے قبول کیا۔ دوسرا علم توکل، معاملہ اور محبت کا علم تھا اس کو خواص نے قبول کیا۔ اور تیسرا علم 'علم حقیقت' تھا جس کو لوگوں کے قلب و ذہن قبول نہیں کر سکے۔ اور انھوں نے مجھ کو چھوڑ دیا اور مجھ پر تنقیدیں کرنے لگے۔

صوفیہ کی یہ اشاراتی زبان وقت کے ساتھ اور نکھرتی گئی۔ اس میں اضافے ہوتے رہے اور صوفیہ کی جرأت گفتار میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح کی مرموز گفتگو کا انتہائی نقطہ شطحات ہیں۔ شطح ایک نامانوس لفظ ہے۔ اس سے مراد صوفیہ کی وہ عبارتیں اور ان کے وہ دعاوی لیے جاتے ہیں جو وہ حالت سکر کے زیر اثر کرتے ہیں اور جن میں جناب باری تعالیٰ عزاسمہ کے بارے میں ایسے جملے کہے جاتے ہیں جن کا ظاہر گستاخانہ ہوتا ہے۔ صوفیہ نے شطحات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور شطح اور غیر شطح کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اور ایسا اس لیے ضروری تھا کہ بہت سے نقلی صوفی بھی وجد اور سکر کا اظہار کر کے اول فول کہنے لگے تھے۔ صوفیہ کے مطابق شطح چاہے قابل قبول نہ ہو لیکن اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ چونکہ شطح کا صدور اس وقت ہوتا ہے جب سالک اپنے حواس میں نہیں ہوتا اور جو اپنے ہوش میں نہ ہو اس پر مواخذہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ابونصر سراج نے کتاب اللمع میں شطحات پر ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ مشہور صوفی روز بھان بقلی نے اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب شرح شطحیات لکھی۔ عصر حاضر میں تصوف کے نامور اسکالر کارن ارنیسٹ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے The Words of Ecstasy in Sufism صوفیہ کی طرف سے جب شطحات کا صدور ہونا شروع ہوا تو ابتدا میں یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا تھا اور عوام ان الفاظ کے صدور کی بنا پر صوفیہ کو بہت مطعون کرنے لگے تھے۔ غالباً انھی وجوہات کی بنا پر حضرت جنید بغدادی جیسی شخصیت نے ابویزید بسطامی کے شطحات کی شرح میں ایک مستقل کتاب لکھی جس کا ایک حصہ کتاب اللمع میں موجود ہے۔ (۱۸)

شطحات کے علاوہ بعض صوفیہ نے اپنے اس پورے سفر کو جس میں سالک زمان و مکان کی

کائنات سے گزر کر عالم برزخ اور عالم مثال تک پہنچتا ہے۔سفر ناموں کی شکل میں بھی لکھ دیا ہے۔اس طرح کی کتابوں میں نفری کی المواقف اور ابن عربی کی الاسراء والمعراج بہت مشہور ہیں۔

صوفیہ کی اس مرموز زبان، مشکل الفاظ اور شطحات کی فتح وکشاد کرنے کی کوشش بہت سے لوگوں نے کی ہے۔صوفیہ کے ان مرموزات واشارات کی تقسیم بندی کی جائے توان کو بڑی آسانی سے تین قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر وضحی یونس نے القضایا النقدیہ فی النثر الصوفی میں تقسیم بندی کی ہے(۱۹) ان کے مطابق صوفیہ کے یہ مرموزات یا تو ذہنی ہیں یا حسی ہیں یا مجازی ہیں۔ذہنی مرموزات کا جہاں تک تعلق ہے تو دراصل ان کی عبارت مرموز نہیں ہوتی لیکن اس عبارت میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ فہم وادراک سے بالاتر ہوتی ہے۔مثلاً ابویزید بسطامی کی ایک عبارت ہے: میں ایک مرتبہ بلند ہوا حتیٰ کہ میں اپنے رب کے سامنے کھڑا ہو گیا۔میرے رب نے مجھ سے کہا کہ اے ابویزید میری مخلوق تجھ کو دیکھنا چاہتی ہے۔تو ابویزید نے کہا کہ پھر آپ مجھے اپنی وحدانیت سے مزین کر دیجیے کہ تیری مخلوق مجھے دیکھے تو کہے کہ ہم نے تجھے دیکھا اور وہ تو خود ہی ہو اور میں وہاں نہ ہوں۔ ابویزید کہتے ہیں کہ میرے رب نے ایسا ہی کیا پھر مجھے کھڑا کیا، زینت بخشی اور بلند کیا۔پھر کہا کہ میری مخلوق کی طرف جاؤ، تو میں وہاں سے ایک قدم مخلوق کی طرف چلا، دوسرا قدم اٹھایا ہی تھا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔تو میرے رب نے آواز دی کہ میرے حبیب کو واپس کر دو چونکہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"(۲۰)

ابویزید نے اس میں اپنے ایک روحانی تجربہ کا ذکر کیا ہے جس میں خدا ان کے ساتھ ہم کلام ہوا۔واضح رہے کہ اجلہ صوفیہ کی وضاحت موجود ہے کہ یہ تجربہ حقیقی نہیں ہوتا بلکہ غایت عشق کا ایک مقام ہے جہاں سالک ذہنی طور پر ایسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے ورنہ اللہ جل وعلا کی ذات وراء الوراء ہے سیدنا کلیم اللہ کے لیے جہاں لن ترانی کا فیصلہ ہوا اس درگاہ میں اوروں کی کیا مجال۔ابویزید بسطامی کو ایک ذہنی تجربہ ہوا تھا اس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا۔جیسا کہ خود ان کے شطحات میں ان کے الفاظ میں منقول ہے۔ان کے تجربے کا یہ بیان اپنے اظہار میں واضح ہے اس کی زبان سادہ ہے لیکن اس کے اطلاقات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے لیکن عبارت واضح ہے۔

دوسری قسم رمز حسی کی ہے یہ عام طور پر ایک لفظ میں مرموز ہوتا ہے یعنی صوفیہ کرام عالم محسوسات کے کسی ایک لفظ کے ذریعہ اپنے روحانی تجربہ کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں اس تجربہ کے اظہار میں لفظ

اپنے حسی محمول کے لیے تو واضح ہوتا ہے لیکن اس کی تکوین اور اس کے معنی کی گیرائی عام آدمی کی فہم سے بالاتر بلکہ بسا اوقات خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً ابو یزید بسطامی فرماتے ہیں:

''جب میں مقام وحدانیت پر پہنچا تو میرے لیے توحید کے مشاہدہ کا پہلا لمحہ تھا میں محض اپنی عقل کے سہارے اس میں دس سال چلتا رہا حتی کہ میری عقل درماندہ ہوگئی (پھر مجھے اس ذات کی طرف سے رہنمائی ملی) اور میں پرندہ بن گیا جس کا جسم احدیت کا تھا اور جس کے 'پر' دیمومت (ہیشگی) کے تھے''۔(۲۱)

اس عبارت میں جسم فنا کا استعارہ ہے اور پر بقا کا استعارہ ہے، احدیت سے اس ذات کی مکنونیت کی طرف اشارہ ہے اور دیمومت سے مراد اس کی تجلیات کا ظہور ہے۔ پرندہ ایک حسی وجود ہے سالک نے اپنے تجربے کو اس کے ذریعے بیان کیا ہے۔ لیکن سالک نے جس پرندہ کا ذکر کیا ہے اس کا کوئی وجود نہیں اور حسی پرندہ سے اس کا تعلق نہیں۔ بس سالک اپنے تجربہ کو بیان کرنا چاہتا ہے درماندگی میں اس کی زبان سے پرندہ نکلا۔ لیکن وہ کوئی واضح مشابہت اور مثالیت کا حامل نہیں ہے۔ اس لیے اس پرندے کو دیمومت اور احدیت سے جوڑ کر بتا دیا کہ وہ اڑنے والا پرندہ نہیں کچھ اور ہے۔

بعض صوفیہ نے اس طرح کے تجربات کے اظہار کے لیے پروانہ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے بعض نے چراغ کا استعارہ استعمال کیا ہے اسی طرح تارہ، چاند، بادل وغیرہ کے حسی اشارے میں اپنے مشاہدات کا بیان کیا ہے۔ صوفیہ کی مرموز گفتگو میں سب سے زیادہ استعمال رمز حسی کا ہے۔

تیسری قسم رمز مجازی ہے صوفیہ کے یہاں اس کی بھی بکثرت مثالیں ملتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صوفیہ اپنے تجربات کے اظہار کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال کرتے ہیں جو معروف تو ہو لیکن اس کا کوئی حسی وجود نہ ہو، مثلاً بعض صوفیہ راہ سلوک کے بعض مقامات کے اظہار کے لیے لفظ تیہہ استعمال کرتے ہیں یہ ایک طرح سے وہ کیفیت ہوتی ہے جس میں سالک سفر کا آغاز تو کر دیتا ہے لیکن نشان منزل سے ہنوز ناآشنا ہوتا ہے۔

تصوف میں باضابطہ فنی تصنیف کا آغاز ہوا تو ان تصنیفات میں صوفیہ کی اس مرموز گفتگو اور اشارات ولطائف کے لیے بھی ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے اور جو چیز اب تک خطوط یا ان کی مجلسوں تک محدود تھی وہ صفحہ قرطاس پر سفر کرنے لگی۔ ان مصنّفین نے صوفیہ کے ان خطوط اور ملفوظات کو نقل کرنے

کے ساتھ ساتھ ان کی تشریح بھی کی۔

امام قشیری نے صوفیہ کے ذریعہ استعمال ہونے والے مخصوص الفاظ کو ایک خاص معنی دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے تمہید یہ رکھی کہ جس طرح ہر فن کے ماہرین کی کچھ مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں اسی طرح یہ بھی صوفیہ کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ ان کا مقصد اپنے مسلک کی انفرادیت اور نااہلوں سے ان اسرار کی حفاظت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"یہ بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ ہر فن کے علما خاص قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جنھیں دوسرے فن کے علما اس طرح استعمال نہیں کرتے۔ وہ آپس میں خاص اغراض کی بنا پر ان الفاظ کے معنی پر اتفاق کر لیتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس طرح مخاطب کو سمجھانے میں آسانی ہوتی ہے۔ یعنی جب یہ الفاظ بولے جائیں گے تو صوفیہ ان کا مفہوم پوری طرح سمجھ لیں گے۔ یہ لوگ آپس میں خاص قسم کے الفاظ اس لیے بھی استعمال کرتے ہیں تاکہ ان کے معانی صرف وہ اجمالاً سمجھیں اور دوسرے لوگ جو اس طریقے سے اختلاف رکھتے ہیں ان سے وہ معانی و مطالب پوشیدہ رہیں۔ کیونکہ ان کی غیرت گوارہ نہیں کرتی کہ ان کے اسرار نااہلوں میں شائع ہوں، اس لیے ان الفاظ کے حقائق نہ تو کسی قسم کے تکلف سے جمع کیے گئے ہیں اور نہ کسی تصرف سے بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کے دلوں میں القاء کر دیا ہے اور حقائق کے لیے کچھ لوگوں کے اسرار (قلوب) منتخب کر لیے ہیں۔"(۲۲)

زبان کے ساتھ بہت سے مسائل ہیں۔ عام گفتگو میں بھی زبان اپنے منطوق کی پوری غماز نہیں ہوتی۔ بلکہ منطوق کے لیے اشارہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی بات کو سمجھنے میں مختلف لوگوں کی مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔ اور انسان کے احوال و ظروف کے اعتبار سے ایک ہی عبارت ایک سے زائد معنی کی متحمل ہو سکتی ہے۔ قدامہ بن جعفر نے نقد النثر میں ایک اہم نکتہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "ظاہر باطن کا محتاج ہوتا ہے اور باطن ظاہر کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے ہر باطن کا ظاہر ہی اس کے باطن کی طرف رہنمائی کرتا ہے (اور باطن میں تعدد یا درجہ بندی ممکن ہے)۔ اگر اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو ظاہر کر دیتا تو تمام انسانوں کا علم مساوی ہو جاتا۔"(۲۳)

زبان جن معنی کے لیے وضع ہوتی ہے ان کے لیے بھی پوری طرح غماز نہیں ہوتی تو ایسے معانی و مفاہیم جو زبان کی گرفت سے ماوراء ہیں ان کے لیے زبان مکمل دلیل اور بیان نہیں ہو سکتی۔ اس

لیے تصوف کے موضوع پر لکھنے والوں نے صوفیہ کے ذریعہ استعمال کیے گئے الفاظ کی وضاحت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش دو طرح کی ہے، ایک تو صوفیہ کی مخصوص اصطلاحات کا بیان ہے۔ وہ اصطلاحات عام طور پر فنی مباحث ہیں اور ان کی ایک حد تک وضاحت ہو سکتی ہے، چنانچہ اللمع فی التصوف اور الرسالۃ القشیریہ میں ایسے متعدد الفاظ کا مصداق متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور امام قشیری نے ان الفاظ کی تشریح سے قبل ایک طویل تمہید لکھی ہے جس کا تذکرہ اوپر آیا ہے۔

دوسری وہ عبارتیں ہیں جن میں کسی تجربہ کا اظہار ہے۔صوفیہ میں سے بعض نے ان عبارتوں کی وضاحت بھی کرنے کی سعی کی ہے۔لیکن اس کی کوئی جامع کتاب نہیں ہے۔ بلکہ کتابوں میں مختلف عبارتوں کی اپنے ذوق وفہم کے مطابق وضاحت کی ہے۔ غالباً اس سلسلہ کی سب سے پہلی کوشش حضرت جنید بغدادی نے کی تھی۔ انھوں نے ابو یزید کے شطحات کی تفسیر لکھی تھی۔اس کے کچھ نمونے ابونصر سراج نے اللمع فی التصوف میں جمع کردیے ہیں،صوفیہ نے ان عبارتوں اور تجربات کی وضاحت کے کچھ اصول متعین کیے ہیں۔صوفیہ کے ان اشارات کے بارے میں پہلا اصول تو یہ ہے کہ وہی اشارات قابل قبول ہیں جو نصوص شرعیہ کے موافق ہوں۔ مثلاً رویم نے کہا ''اصح الحقائق ما قارن العلم'' (۲۴) (سب سے زیادہ صحیح حقائق وہ ہیں جو علم یعنی شریعت کے موافق ہوں) اس لیے کسی صوفی کے وہ تجربات جو شریعت کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں ہوں گے۔

صوفیہ جس حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جو حقائق ان پر منکشف ہوتے ہیں ان میں تعدد بھی ہے اور درجہ بندی بھی ہے خود صوفیہ کو اس کا ادراک تھا، ابو جعفر صیدلانی فرماتے ہیں کہ حقائق کی تین قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ حقائق ہیں جو شریعت کے تابع ہیں دوسری قسم وہ حقائق ہیں جو علم یعنی شریعت کے تابع تو نہیں لیکن علم ان کا ساتھ دیتا ہے اور تیسری قسم ان حقائق کی ہے جو جام علم سے چھلک جاتے ہیں۔ ابوبکر شبلی فرماتے ہیں زبان تین طرح کی ہوتی ہے اول لسان علم دوم لسان حقیقت اور سوم لسان حق، لسان علم وہ ہے جو واسطوں سے پہنچتی ہے اور لسان حقیقت وہ ہے جس کو اللہ تعالی بغیر واسطہ کے دلوں میں اتارتا ہے اور لسان حق کے لیے اس نے کوئی طریقہ نہیں رکھا ہے۔ (۲۵)

صوفیائے کرام کی مخصوص زبان اور ان کے اشارات ورموز کی دنیا بہت وسیع ہے اس مختصر مضمون میں اس زبان کی حقیقت کو سمجھنے کی طرف کچھ اشارے کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔اس

کاوش ناتمام کا حاصل یہ ہے کہ صوفیائے کرام کے روحانی تجربات کی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے لیے جو اہمیت ہے وہ اپنی جگہ، زبان و بیان کے اندر وسعت پیدا کرنے میں بھی ان تجربات اور ان کے اظہار نے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ اگر اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو اس سے زبان اور اظہار ادا کے بہت سے گوشے نئے مفاہیم کی صورت میں جلوہ گر ہوں گے۔

حواشی

(۱) محمد بن عبدالجبار النفری: المواقف والمخاطبات، تحقیق آر بری، مکتبہ متنبی القاہرہ، ۱۹۳۵ء، ص ۵۱۔ (۲) ایضاً، ص ۵۱۔ (۳) ایضاً، ص ۵۳۔ (۴) ایضاً، ص ۵۳۔ (۵) ابوالنصر السراج: اللمع فی التصوف، تحقیق ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور طٰہٰ عبدالباقی سرور، دارالکتب الحدیثہ، ۱۹۶۰، ص ۴۱۴۔ (۶) ابوبکر الکلاباذی: التعرف لمذھب اھل التصوف، تحقیق ڈاکٹر عبدالحلیم محمود اور طہ عبدالباقی سرور، دارلکتب الحدیثہ، ۱۹۶۰ء، ص ۸۷۔ (۷) اللمع فی التصوف، ص ۴۱۴۔ (۸) ایضاً، ص ۴۱۴۔ (۹) التعرف لمذھب اھل التصوف، ص ۸۹، اردو ۱۳۴۔ (۱۰) اللمع فی التصوف، ص ۴۱۴۔ (۱۱) ایضاً، ص ۴۱۴۔ (۱۲) ایضاً، ص ۳۱۲۔ (۱۳) ایضاً، ص ۳۰۵۔ (۱۴) ایضاً، ص ۳۱۲۔ (۱۵) ابوالقاسم القشیری: الرسالۃ القشیریہ، تحقیق معروف مصطفی رزیق، المکتبہ العصریہ، بیروت ۲۰۰۱ء، ص ۵۳۔ (۱۶) التعرف لمذھب اھل التصوف، ص ۸۸۔ (۱۷) عبدالرحمٰن جامی: نفحات الانس، تحقیق محمود عابدی، طبع اصفہان، ص ۲۸۔ (۱۸) اللمع فی التصوف، ۴۵۳۔ (۱۹) ڈاکٹر وضحی یونس: القضایا النقدیہ فی النثر الصوفی، دمشق ۲۰۰۶ء، ص ۹۸۔ (۲۰) اللمع فی التصوف، ص ۴۶۱۔ (۲۱) السہلجی: النور من کلمات ابی طیفور مرتب عبدالرحمن بدوی ضمن شطحات الصوفیہ، الکویت طبع دوم ۱۹۷۸، ص ۱۴۹۔ (۲۲) الرسالہ، ص ۵۳۔ (۲۳) قدامہ ابن جعفر: نقد النثر، تحقیق: طٰہٰ حسین اور عبدالحمید العبادی، طبع قاہرہ ۱۹۳۳، ص ۱۴۔ (۲۴) اللمع فی التصوف، ص ۲۸۶۔ (۲۵) نفحات الانس، ص ۲۸۔

رسالہ ’’النبی الموعود‘‘

ایک تعارف

☆ڈاکٹر معین الدین شاہین

’’النبی الموعود‘‘ سیرت پاک سے متعلق اہم رسالہ ہے، جس کے مولف سابق ریاست بیکانیر کے وکیل منشی محمد امیر الدین خاں ہیں، جن کی ولادت قصبہ سنگھانہ سابق ریاست جے پور (موجودہ ضلع جھنجھنوں، راجستھان) میں ہوئی تھی، امیر الدین خاں کے والد ماجد محمد جہانگیر خاں علاقے کے رئیس تھے، انھوں نے اپنے فرزند کو اعلیٰ تعلیم دلائی، بعد میں امیر الدین خاں ریاست بیکانیر میں عہدۂ وکیل پر فائز ہوئے اور مستقل طور پر بیکانیر میں سکونت اختیار کی اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

امیر الدین خاں کے بیکانیر میں شعر وشاعری کا عام ماحول تھا، نثر نویسی کی طرف رجحان کم تھا تاہم انھوں نے نثر نگاری کی طرف توجہ دی، چونکہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت سے بے پناہ متاثر تھے اس لیے سیرت طیبہ ہی کو انھوں نے موضوع بنایا۔ لکھتے ہیں:

> ’’النبی الموعود۔ یہ اسم لطیف مولف کی زبان پر اس کتاب کے عالم وجود اور منصۂ شہود پر آنے سے پہلے ان پیشین گوئیوں کے پڑھنے سے تھا، جو توریت وانجیل اور دیگر صحف انبیائے علیہم السلام میں دربارہ مبعوث ہونے نبی الموعود صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مذکور ومسطور میں یکم ربیع الاول ۱۳۱۷ھ کی شب کو مولف کے کاشانہ امید اور خانہ آرزوئے جاوید کو ایک گوہر شب چراغ نے اپنے نورانی انوار سے روشن کیا یعنی فرزند و دل بند جگر پیوند تولد ہوا اور اس مولود مسعود کا نام امیر احمد رکھا، اس مسرت کے شکریہ میں محفل میلاد کا جلسہ منعقد ہوا، اس مقدس اور مبارک جلسہ میں طرب انگیز خیال پیدا

☆ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج۔ ۳۰۵۰۰۱، راجستھان۔

ہوا کہ ایک مختصر سا رسالہ حالات سرورِ کائنات میں ترقی یافتہ زمانۂ حال کی ضرورت اور جدید خیالات کیف آیات کے موافق جس میں نبی الموعود صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس زندگی کے متعلق کافی حالات اور تاریخی واقعات ہوں، لکھا جاوے کہ جو واقفیت عام کے لیے مضبوطی ایمان کا باعث اور اخلاقی درستی کا ذریعہ بنے، اس خیال کی بنا پر عرق ریزی اور کوشش تمام سے یہ رسالہ جمع کیا گیا اور حالات پیدائش آنحضرتؐ کو مولود نامہ کے طرز پر لکھا"۔(۱)

منشی امیر الدین خاں کی یہ تحریر ۲۶/دسمبر ۱۹۰۶ء مطابق ۹/ذی قعدہ ۱۳۲۴ھ کی ہے، ۱۹۰۷ء میں یہ رسالہ حافظ محمد حسین ضیاؔ ضیائی جنتری نے اپنے مطبع نور الانوار پریس میرٹھ میں طبع کیا جس کے سرورق پر یہ تحریر درج ہے:

مُبَشِّرًا ۢ بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُہٗٓ اَحْمَدُ

رسالہ

النبی الموعود

یعنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح عمری کا

(حصہ اول)

"جس میں آفرینش عالم۔ تحقیق آدم۔ جنت و اولاد آدم و حضرت اسماعیل و ہاجرہ۔ بناء کعبہ۔ حجر اسود۔ بت پرستی و مذہب اہل عرب و بشارات و نسب نامۂ آنحضرت صلعم اور ایام ولادت سے وفات تک آپؐ کے حالات و واقعات و غزوات و اشاعت اسلام کا ذکر نہایت شرح و بسط سے لکھا گیا ہے"۔

رسالۂ مذکورہ کے اندرونی صفحہ پر اس کے حصہ دوم کے سلسلے میں ایک اعلان بھی ہے۔

اعلان

حصہ دوم النبی الموعود

ناظرین باتمکین، حصہ اول تو آپ کے پیش نظر ہے، دیکھیے اور کیف اٹھائیے، دوسرا حصہ بھی عنقریب شائع ہونے والا ہے، جس کے مضامین ہدیۂ نظر کیے جاتے ہیں: دیباچہ۔ بیان اخلاق۔

اخلاق مطلق۔اخلاق النبی۔شجاعت و بہادری۔حلم و بردباری۔سخاوت وفیاضی۔صبر وشکر۔عفوومعانی۔ رحم وکرم۔شرم وحیا۔زہدوتقویٰ۔شرافت نسبی۔عظمت حسبی۔حلیہ شریف جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔قبل از ظہوراسلام دنیا کی مذہبی دستوری حالت اوراس کی اصلاح کاارادہ۔آپؐ اور آپؐ کے رفقا کی دردناک تکالیف اورمصیبتوں پرریمارک۔مسلمانان قرن اول مجسم اسلام کی تصویریں۔اسلام کا فطرت انسانی کے مطابق موضوع ہونا۔قیام مدینہ منورہ میں صحابہ کے باہمی برتاؤ اورافلاس وتنگدستی اور بھوک کی مصیبت۔منافقین و یہود کی مخالفت وشرارت کے مقابلے میں مسلمانوں کی بیچارگی ومجبوری کا دردانگیز سماں۔کفار مکہ کے پے درپے حملوں کے مقابل جہاد کی ضرورت اوروعظ کی صورت میں آیات قرآنی و احادیث کے مطابق جہاد اسلامی کی اصلیت۔منشاء جہاد۔وجہ فرضیت جہاد۔ضرورت جہاد مسلمانوں کا شوق شہادت۔ان کی ایمانی مضبوطی۔جوش شجاعت۔ہمت اولوالعزمی۔رفاقت جاں نثاری ووفاداری پر بحث۔ترقی اوراشاعت اسلام کا دلچسپ نظارہ،اس کے بعد معقولی طور پراسلامی تعلیم کی فلاسفی متعلق بعقائد۔جناب باری تعالیٰ کی ذات وصفات۔توحید کا تذکرہ۔ملائکہ وکتب آسمانی۔انبیاء۔قیامت۔ قضاوقدر۔موت کے بعد جی اٹھنا۔اور متعلق میعادات۔کلمۂ طیبہ۔نماز۔روزہ۔حج۔زکوٰۃ۔سب فلسفیانہ طریقہ پر مذکور ہوئے ہیں اوراسلامی تمدن ومعاشرت اورحقوق العباد کے متعلق بکثرت مسائل پر بحث کی گئی ہے،قیمت فی جلد ۲ روپے مقرر ہے اور ۳۱/دسمبر ۱۹۰۷ء تک پتہ ذیل سے درخواست کرنے والوں کو فی جلد ۱/روپیہ قیمت پر ملے گا،محصول ڈاک وغیرہ بذریعہ خریدار ہوگا،......کو ہمیشہ ۱/روپیہ قیمت پر دیا جاوے گا۔سوداگران کو اصل قیمت پر بحساب فیصدی ۳۳/روپیہ کمیشن مل سکتا ہے، ....(۲)خریدار کو ایک جلد مفت۔

''المشتہر: منشی محمد امیر الدین خاں وکیل عدالت ہائے ریاست بیکانیر''۔

اس رسالے کا دوسرا حصہ کب شائع ہوا؟بعض بزرگ حضرات فرماتے ہیں یہ حصہ شائع تو ہوا تھا لیکن تقسیم ہند کے دوران تلف ہوگیا،منشی امیر الدین خاں کے نواسے بیکانیر کے مشہور شاعر مرحوم خلیق احمد خلیقؔ بیکانیری جوادبی دنیا میں خلیق عزیزی بیکانیری کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ سلسلۂ مرزا غالبؔ سے ہیں،ان کے آخری ایام میں صرف راقم الحروف ان کا دمساز وہمراز تھا،راقم ہی نے ان کا مجموعہ ''نذر غالب واقبال'' مرتب کیا تھا،ان کا بیان ہے کہ میرے ماموں امیر احمد ایک کم علم آدمی

تھے، وہ رسالہ ''النبی الموعود'' کا مخطوطہ پاکستان لے گئے تھے اور ایک دولت مند شخص کو موٹی رقم لے کر فروخت کردیا تھا، جو بعد میں پاکستان سے کسی دوسرے شخص کے نام سے شائع ہوا، لیکن یہ بات کیسے مانی جاسکتی ہے کہ جب دوسرے حصہ کی وصولی کے لیے مذکورہ اشتہار واعلان میں ۳۱ردسمبر ۱۹۰۷ء تک رقم بھیجنے کی بات کہی گئی ہے، تقسیم ہند کا المیہ تو اس کے چالیس سال بعد پیش آیا، اس بابت خود مولف رسالہ منشی امیر الدین نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ''جب مولف نے پہلا حصہ تالیف کرنے کے بعد دوسرے حصہ کی تصنیف کے لیے قلم اٹھایا تو کسی نا معلوم مرض کی وجہ سے مصنف کا دست راست لکھنے کے کام سے بالکل بیکار ہوگیا اور اب تک اسی بیکاری کی حالت میں ہے، لیکن جب دست چپ سے لکھنا شروع کیا تو دوسرے ہی دن قلم نے باعتبار خط اور تیزی کے وہی رفتار حاصل کرلی جو اس کو داہنے ہاتھ کے توسط سے حاصل نہ تھی، یہ عادت کے خلاف دست چپ کی تیز رفتاری ایک قدرتی کرشمہ ہے جو مولف کو اس کتاب کی مقبولیت اور اثر پر یقین دلا رہا ہے، دونوں حصوں کی تکمیل کے لیے یہ عمدہ فقرہ حسب حال ہوتا ہے کہ اس ناچیز مولف و مصنف نے یہ کام دونوں ہاتھوں سے انجام دیا ہے، تصحیح میں سعی وافر اور کوشش کامل کی گئی مگر چونکہ الانسان مرکب من الخطاء والنسیان اظہر من الشمّس ہے، لہٰذا رفع اغلاط کے لیے فہرست غلط نامہ بھی لگادی ہے۔(۳)

منشی امیر الدین خاں کے مذکورہ بیان سے معلوم ہوا کہ دوسرے حصے کی تکمیل انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کی تھی ، النبی الموعود کے حصہ اول کی پشت پر ایس۔اے۔ایچ منصرم نور الانوار پریس شہر میرٹھ کی طرف سے کچھ کتابوں کے اشتہارات اور اطلاعات واعلانات چھاپے گئے ہیں، ان میں النبی الموعود کے حصہ دوم کے متعلق یہ اعلان بھی ملتا ہے جس کی تفصیل اس طرح ہے:

''اعلان''

''رسالہ النبی الموعود کے حصہ دوم کی خریداری کے متعلق جو درخواستیں ۳۱ردسمبر ۱۹۰۷ء تک وصول ہوں گی ان خریداروں سے نصف قیمت یعنی ۱ر روپیہ لیا جائے گا''۔

اس اعلان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی جلد یا حصے کی طرح دوسری جلد بھی مطبع نور الانوار پریس میرٹھ میں زیر اشاعت تھی اور یقینی طور پر شائع بھی ہوئی ہوگی ، اس لیے خلیق عزیزی کا محولہ بالا بیان لاعلمی یا ظن وقیاس پر مبنی ہے، یہ تو ہوسکتا ہے کہ دوسرا حصہ کسی وجہ سے تلف ہوگیا ہو، واضح ہو کہ

پہلا حصہ ہی راقم کو بڑی محنت و مشقت کے بعد ملا تھا، یہ حصہ خلیق عزیزی کا عنایت فرمودہ ہے۔

راقم الحروف کا سلسلہ قیام بسلسلۂ ملازمت پچھلے ستائیس سالوں سے بیکانیر میں ہے لیکن مسلسل تلاش و تفتیش کے باوجود ''النبی الموعود'' کی دوسری جلد نہیں مل سکی ، ہندوستان و پاکستان کے متعدد محققین و علمائے دین سے بھی اس سلسلے میں استفسار کیا گیا لیکن سبھی نے مذکورہ رسالے سے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا، اس لیے زیر نظر مضمون میں النبی الموعود کی جلد اول ہی زیر بحث ہے۔

خلیق بیکانیری نے کئی مرتبہ راقم الحروف کو بتایا کہ میرے نانا جان مولف النبی الموعود عجز و انکسار کی چلتی پھرتی تصویر تھے، انہوں نے کبھی مصنف یا انشاء پرداز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور وہ مجھے بھی یہی تلقین کرتے تھے کہ میاں دعویٰ، غرور، تکبر اور خودنمائی و خودستائی سے گریز کیا کرو، خلیق صاحب کی بات کی تصدیق منشی امیرالدین خاں کی اس تحریر سے بھی ہوتی ہے جس میں انہوں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''چونکہ مولف عربی داں عالم و فاضل یا مشہور و معروف مولف یا مصنف نہ تھا اس لیے یہ کام سخت مشکل معلوم ہوا اور عدم واقفیت زبان عربی اور مکروہات زمانہ کی وجہ سے مولف کا تالیفی سلسلہ کچھ عرصہ تک چل کر رک گیا اور دل پر ایک مایوسی سی چھا گئی، لیکن شوق تالیف و تصنیف کا ولولہ دل سے محو اور زائل نہ ہوا، مجبوراً مولف نے اپنے ارادۂ تالیف کی تکمیل کے لیے قرآن مجید اور احادیث و سیر کے ترجموں اور کتب مناظرہ علماء محققین کو اپنا رہبر قرار دے کر غور و فکر بے حد شروع کی جس کی وجہ سے ہمت بڑھتی رہی اور ذہنی جودت اور معلومات میں وسعت پیدا ہوگئی، آخر اسی مایوس طبیعت نے تمام مشکلات پر عبور کر کے یہ فیصلہ کر دیا کہ تاریخی واقعات و حالات کو مختصر صورت میں لکھنا اور ان سے نتائج اخذ کر کے ان پر رائے زنی یا ریمارک کرنا محض علمیت ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس میں خداداد عقل اور ذہانت انسانی کا بھی حصہ ہے۔
>
> اس خیال نے جس کو تائید غیبی سے تعبیر کیا جانا کچھ بیجا نہ ہوگا مولف کے ارادہ میں مضبوطی اور تالیف و تصنیف کے شوق کو حد سے زیادہ بڑھا دیا اور رہبر کامل کا کام دیا

اس لیے مولف کا ابتدائی ارادہ جو محض مولود نامہ ہی کی تالیف کا تھا، وہ یہاں تک ترقی کر گیا کہ مولف جیسے ہیچ مداں کے قلم سے یہ نادر کتاب جو دو حصوں میں تقسیم ہے، جمع ہوگئی جس کو رسول کریم ﷺ کی مختصر مگر کامل سوانح عمری کہنا ہرگز مبالغہ میں داخل نہیں ہے، پہلے حصہ میں محض تاریخی واقعات اور حالات مندرج ہیں اور دوسرے حصہ میں ان کے نتائج پر فلسفیانہ بحث کی جا کر محققانہ ریمارک کیا گیا ہے، یہ دوسرا حصہ مصنف کا مایۂ فخر و ناز معقول پسند مسلمانوں اور منصف مزاج اشخاص غیر مسلم کو تعلیم اسلامی کی خوبی دکھا کر نبی الامی ﷺ کی عظمت و بزرگی ان کے ذہن نشین کر دینے کے لیے یقیناً ایک ذریعہ ہوگا''۔(۴)

جب رسالہ النبی الموعود کا حصہ اول مکمل ہوا تو بیکانیر میں مقیم ہندو مسلم شعرا و ادبا نے اپنی نثری و شعری تقریظات اور تاریخی قطعات کے حوالے سے منشی امیر الدین خاں کی تعریف و توصیف بیان کی، اب یہ سب بہ مشکل ملتی ہیں، اس لیے یہاں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں تا کہ بیکانیر کے شعر و ادب پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات کے لیے بھی کار آمد ثابت ہوں اور دوسری طرف رسالہ النبی الموعود اور اس کے مولف منشی امیر الدین خاں کے متعلق معلومات عام ہو سکیں، پہلے محمد عبدالرحمٰن خاں امروہوی تلمیذ حافظ عبدالحق کا وہ بیان ملاحظہ ہو جو انہوں نے ''خاتمۃ الطبع'' کے زیر عنوان پیش کیا:

''زمزمہ سنجی حمد الٰہی و ترانہ ریزی لغت رسالت پناہی کے بعد ہر سر موئے بدن صرف سپاس آرائی ہے اور ہر رگ و پے وقف شکر سرائی کہ کتاب لاجواب وصحیفہ رحمت مآب ذخیرہ اذکار محبوب رب ودود مسمیٰ النبی الموعود ریختہ قلم ندار ندرقم سر دفتر عشاق مصدر انوار لولاک لما خلقت الافلاک و سر حلقہ شیفتگان دیدار مظہر آثار و ما ارسلناک جاں نثار سید کون و مکاں شیدائے زار شہنشاہ کن فکاں مجمع جود و احسان جناب منشی امیر الدین خاں صاحب وکیل عدالت ریاست بیکانیر بہ کمال خوبی و اسلوبی اہتمام و صحت تام و خوشخطی مالا کلام در مطبع نور مرقع نور الانوار پریس میرٹھ حسب اشارات جناب حافظ محمد حسین صاحب ضیاؔ خلف الصدق فرس مضمار سخن دانی یکہ تاز میدان بیان و معانی جناب حافظ محمد امداد حسین صاحب ظہورؔ و عرفاؔنی قریشی حنفی

قادری رئیس میرٹھ بحسن انصرام وخوبی انتظام کار پردازان مطبع بماہ فروری ۱۹۰۷ء جلوہ آرائے انطباع گردیدہ بحلیہ عالم افروزی وزیور جہاں فیروزی تجلی ریز شہرت عام گردید“۔(۵)

بعدازاں حضرت مولانا مولوی ابوعبدالرحمٰن محمد غضنفر علی صاحب علوی لودیانوی وکیل دربار دولت عباسیہ عالی جناب ریاست بھاولپور، متعینہ دربار عالی ریاست بیکانیر راجپوتانہ نے اس طرح اپنے جذبات کا اظہار فرمایا:

”آج یہ کتاب (النبی الموعود) کہ مختصر سیرۃ سیدنا المصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہ وسلم ہے، کئی جلسات کے بعد علی سبیل الاستیعاب الاّ ما شذّ مطالعۃً اختتام کو پہنچی، اس کے مصنف منشی امیرالدین خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے ماشاء اللہ تعالیٰ خوب محنت اٹھا کر بطور حصہ اولیٰ اس کو پورا کیا ہے، گو مصنف عربی دان یا انگریزی خواں نہیں ہے، مگر اس نے ایسی کتب سے کہ عرصہ سے بعض علما نے جو عربی وغیرہ سے تلخیص کے طور پر شائع کی ہیں، عمدہ التقاط و استنباط کیا ہے، گو مقامات کتاب ہذا کا میں نے اصول سے مقابلہ نہیں کیا ہے مگر اکثر جتنا مجھ کو یاد ہے بہ ظن اکثر و اغلب صحیح پاتا ہوں، اس سے علمائے وقت کو خیال ہونا چاہیے کہ جو کام مصنف نے کیا ہے وہ ان کو کرنا چاہیے تھا“۔(۶)

مولوی سید محمد علی صاحب صفاؔ حسنی حسینی قادری گوالیاری جو اس وقت ریاست بیکانیر میں جنرل سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدۂ جلیلہ پر فائز تھے اور ادب کا خاصہ اور ستھرا شغف رکھتے تھے، نے اپنے قطعۂ تاریخ میں اس طرح امیرالدین خاں کی توصیف بیان کی:

میرے مخدوم و مکرم نے واہ　　کیا ہی لکھی ہے یہ مستند تاریخ
مرحبا صل علیٰ اس نے کہا　　جس نے دیکھی مجدد تاریخ
ہے یہ تاریخ نبی موعود　　کیوں نہ ہو اشرف امجد تاریخ
اس میں مرقوم ہیں ایسے حالات　　مفتخر جن سے ہے بے حد تاریخ
باہمہ زینت و تصحیح کمال　　چھپ چکی جب یہ مجدد تاریخ

مجھ سے یوں ہاتف غیبی نے کہا		دیکھی جس وقت یہ مسند تاریخ
اس عجب نسخۂ اقدس کی صفآ		ہے تواریخ محمد تاریخ"(۷)

۱۳۲۴ھ

شیخ محمد ابراہیم آزاد تلمیذ وحید الدین بیخود دہلوی نے "النبی الموعود" کی قدر و منزلت اور مولف کی قدردانی میں اس طرح اپنا نذرانۂ تحسین پیش کیا:

میرے مشفق امیر الدین خاں نے		لکھی نادر کتاب نبی موعود
نبی موعود پر قربان جاں ہے		خدائے لم یزل کا جو ہے موعود
ستائش اس کی زیبا اور بجا ہے		ہوا نابود اس کی وجہ سے بود
تسلی ہاجرہ کے دل کی جو ہیں		بناء کعبۂ عالی کے مفقود
مٹا کر جس نے شرک و کفر تثلیث		دکھایا ایک ہی مسجود و معبود
سر کن سے لکھو تاریخ آزآد		بفضل حق (۸) لکھی النبی الموعود

۱۳ ھ ۲۴

حکیم مرزا انعام اللہ بیگ انعآم دہلوی (۹) جنہیں "بلبل بوستاں"، "شیریں بیاں" اور "حکیم و نباض لاثانی" جیسے القاب سے یاد کیا جاتا تھا، انہوں نے فارسی میں ایک قطعہ تاریخ اور ایک نظم بہ عنوان "تاریخ اردو" لکھ کر دادادی۔

منشی امیر الدین خاں لذات دیں چشیدہ		تالیف کرد یکجا حالات برگزیدہ
انعام را چو فرمود تاریخ او بنشتن		از غیب ایں ندائے درگوش ما رسیدہ
ہشاد و سہ ۸۳ عدد را کن تخرجہ و بنویس		شاید چنیں کتابے چشم فلک[۱۴] ندیدہ (۱۰)

۱۳ ۲۴

تاریخ اردو

یہ نسخہ ہے عجب تاریخ عالم		کہ امر کن سے جس کی ابتدا ہے
اگر کہیے اسے اکسیر اعظم		تو بہتر ہے مناسب ہے بجا ہے
ہے آنکھوں کے لیے کحل الجواہر		مرضہائے ضلالت کی دوا ہے

معطر اس سے ہو کیوں کر نہ عالم ۔۔۔ کہ اس میں ذکر خلق مصطفیؐ ہے
ہے اس میں جلوہ گر نورِ محمد ۔۔۔ جہاں میں چار سو جس کی ضیا ہے
مضامین اس کے ہیں گو مثل دریا ۔۔۔ مگر دریا کو کوزے میں بھرا ہے
لکھو تاریخ طبع اس کی انعاؔم ۔۔۔ خزینہ دیں کا یہ تم کو ملا ہے

۱۳۲۴ھ

انعاؔم دہلوی کی پوری نظم دیکھی جائے تو معلوم ہوتا ہے گویا ''النبی الموعود'' پر منظوم تبصرہ ہے، مشہور شاعر و ادیب حضرت منشی محمد عبداللہ صاحب صوفی بلند شہری، جنہیں اہل بیکانیر امیر دولہا قادری کی عرفیت سے جانتے ہیں، انہوں نے بھی رسالہ مذکورہ کے شایانِ شان قطعۂ تاریخ کہا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ باغ نثر کیا اچھا لگایا ۔۔۔ کہ رضواں کو بھی سو سو طرح بھایا
فصاحت اور بلاغت سے کھلا ہے ۔۔۔ نبی کے ذکر سے کیسا سجایا
امیر الدین خاں صاحب نے دیکھو ۔۔۔ یہ باغ بے خزاں کیسا لگایا
میں تھا اس فکر میں تاریخ لکھوں ۔۔۔ کہ بلبل نے چمن میں یہ سنایا
سر ابجد سے لکھ تاریخ صوفؔی ۔۔۔ مولف (۱۱) تجھ پہ ہو رحمت کا سایا

۱۳۲۳ + ۱ = ۱۳۲۴

انعام اللہ بیگ دہلوی کے صاحبزادے مرزا خداداد بیگ برقؔ دہلوی جو وکیل عدالت ہائے ریاست بیکانیر تھے، ان کی بھی ایک طویل نظم ہے، چند اشعار پیش ہیں:

نبی موعود کی تقریظ و تاریخ ۔۔۔ اور ان کو نظم میں لکھ کر دکھانا
نرا مشکل نہیں ہے بلکہ گویا ۔۔۔ ہے مہر چرخ کو مشعل دکھانا
لہٰذا ختم کر اے برقؔ اس کو ۔۔۔ نہیں مقصود کچھ شیخی جتانا
تو لکھ تاریخ طبع گل کو مرغوب ۔۔۔ کہ اس سے خوش ہوا اپنا بگانا (۱۲)

۱۳۲۴ھ

منشی نصیر الدین متیںؔ خلف الرشید جناب جلال الدین صاحب مرحوم قریشی وچشتی بیکانیری کا قطعہ تاریخ بھی ہے:

ولادت باسعادت خاتم پیغمبراں کا ذکر لکھا توریت اور انجیل عیسیٰ ابن مریم سے
اوران کے جزوکل حالات اوراسلام کی دعوت لکھے ہیں وہ کہ جوثابت ہوئے تاریخ عالم سے
متیں تو سال طبع لکھ پر اٹھائیس کم کردے خبردی ہاتفِ غیبی نے یہ تاریخ عالم سے(۱۳)
۱۳۲۴ھ

بابورام پرشاد تشنہ متوطن قصبہ تھانہ بھون وکیل عدالتہائے ریاست سرکاری بیکانیر نے یہ قطعہ لکھا:

طبع شد تحفہ النبی موعود ظلمت طبع گمرہاں را بدر
ہاتفم گفت از پئے تاریخ گو بدل نسخۂ گرامی قدر(۱۴)
۱۳ ھ ۲۴

منشی محمد شاب خاں شاب جنہوں نے اس رسالے کی کتابت کا فریضہ انجام دیا تھا،ان کا قطعۂ تاریخ بھی ملاحظہ فرمالیجیے:

میرا منھ کیا ہے جو میں لکھوں تاریخ مگر یہ غیب سے آئی ندا ہے
شاب اب لکھ سر ہجرت سے تاریخ یہ نسخہ کیا ہمارا رہنما ہے(۱۵)
۱۳ ھ ۲۴

رئیس میرٹھ منشی مہدی حسن صاحب جوریاست بیکانیر میں مختار عدالت کے عہدہ پر فائز تھے،ان کا قطعہ تاریخ بھی خوب ہے:

نامۂ[۵] ذکرِ رسول عربی بارک[۲۰۰] اللہ حسن خوب چھپا
شہ کونین[۳۰۰] کے تاریخی حال خوبی[۶۰۰] طرز سے باطرفہ ادا
قابل[۱۰۰] داد ہوئے درج کتاب رنگ[۲۰۰] تحقیق کی خوش رنگ فضا
سرو[۶۰] یکتائے گلستان کمال طرز[۹] تحریر میں سرتاپا
باب[۲۱] معنی ہے سہ ہرمصرعہ آیت[۱] سال سے طرزِ زیبا(۱۶)
۱۳ ھ ۲۴

چونکہ یہ رسالہ شہر میرٹھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا،اس لیے میرٹھ کے علما،فضلا اورشعرا وغیرہ کی توجہ کا خاص مرکز رہا،تاہم عالی جناب حافظ محمد امداد حسین صاحب ظہور وعرفانی قریشی حنفی قادری رئیس میرٹھ نے نہ صرف اس رسالے سے متعلق تقریظ سپرد قلم فرمائی بلکہ اپنے منظوم خیالات

سے بھی نوازا، پہلے ان کی تقریظ سے یہ نثری اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''افادت وافاضت پناہ، حقائق ومعارف دستگاہ، نکتہ سنج حقائق حق جوئی وحق آگاہی، اشارت فہم عالم تحقیق دستگاہی، درۃ التاج سخن طرازی، کوکب سپہر سرفرازی، بانی اساس فراست، معمار کاشانۂ دراست، صراف خزینۂ دانشوری، نقاد نقود وفصاحت گستری، عنوان صحیفۂ ایمان منشی امیر الدین خاں صاحب وکیل ریاست بیکانیر، رئیس سنگھانہ کا رسالہ سراسر بہبود ومخزن مفاد وسود، مقبول ومقبولانِ رب ودود مسمیٰ النبی الموعود شرف افزائے مطالعہ اور جلوہ آرائے جمال ہے''۔(۱۷)

آگے اسی قسم کی عبارت ہے جو تنگی صفحات کی وجہ سے پیش نہیں کی جاسکتی۔

آگے قطعۂ تاریخ بھی ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:

بادہ بیغش برائے اہل ذوق ساقی رحمت بساغر ریختہ

ساغر ۱۳۲۴ھ دلخواہ اہل اردو جام مہر آسا منور ریختہ(۱۸)

۱۹۰۷ء

اور بھی قطعات ہیں جن سے اس زمانہ کی اور خصوصاً بیکانیر میں شعر وادب کے ذوق کی بلندی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی چند خصوصیات میرے نزدیک یہ ہیں کہ پیدائش عالم کا سلسلہ جس معقولی و منقولی ترتیب سے محققانہ طریقہ پر درج کیا ہے کسی اور اردو کتاب میں ایسا اب تک میری نظر سے نہیں گزرا، حضرت آدم اور شیطان کا قصہ اور اس کے متعلق واقعات کو ایسے طریقہ پر لکھا ہے کہ جس سے مخالفین اسلام کے اکثر وہ اعتراضات دفع ہوگئے، جو بعض تفاسیر کی بناء پر آیات قرآنی کے متعلق کیے گئے ہیں، بناء کعبہ، حجر اسود، حریت بی بی ہاجرہ اور بنی اسماعیل کے متعلق ان واقعات تاریخی عام لوگوں کے دلوں سے عدم واقفیت کی تاریکی کو زائل کردینے کا ذریعہ ہیں اور ہر واقعہ کو بحوالہ توریت ودیگر صحف انبیاء علیہم السلام وکتب مستند ومعتبرہ علماء محققین کے لکھا ہے، مولود خواں اپنے مخاطب سامعین کے شوق اور دلچسپی کے جوش کا اندازہ کرکے ہر واقعہ کو ان کی واقفیت کے لیے ان کے ذہن نشین کرسکتا ہے، اخلاقی خوبیوں کے ساتھ شرک والحاد کی برائیاں بھی سامنے آجاتی ہیں۔

''رسالہ النبی الموعود'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ سرزمین بیکانیر میں سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق نقش اول ہے، چونکہ تحقیق و تفتیش کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے، اس لیے راقم الحروف کی تلاش جاری ہے، جیسے ہی حصہ دوم کا پتہ چلے گا تو اس کے مطالعے اور مشاہدے کے بعد ہی اسی قسم کا مضمون سپرد قلم کیا جائے گا۔

حواشی

(۱) ''رسالہ النبی الموعود''، منشی محمد امیر الدین خاں، حصہ اول ص ۱۰، ۱۱، مطبع نور الانوار پریس، میرٹھ ۱۹۰۷ء۔
(۲) مرحوم خلیق بیکانیری نے ''النبی الموعود'' کا جو نسخہ راقم کو مرحمت فرمایا تھا وہ از حد بوسیدہ و شکستہ تھا، اس لیے ان حصوں کی تحریر پھٹ کر الگ ہوگئی ہے، معلوم نہیں یہاں کن الفاظ کا استعمال ہوا تھا۔ (شاہین) (۳) ''النبی الموعود''، ص ۱۲، (دیباچہ)۔ (۴) ایضاً، ص ۱۲، ۱۱۔ (۵) ایضاً، ص ۳۰۲۔ (۶) ایضاً۔ (۷) ایضاً، ص ۳۰۴۔ (۸) ایضاً، ص ۳۰۶، ۳۰۵۔ (۹) مرزا انعام اللہ بیگ کے اہل خاندان کثیر تعداد میں آج بھی بیکانیر میں رہائش کرتے ہیں، داؤجی مندر کے قریب ''مرزا منزل'' آج بھی ان کی یادگار کے طور پر بدستور قائم ہے۔ (راقم) (۱۰) رسالہ النبی الموعود، ص ۳۰۶۔ (۱۱) ایضاً، ص ۳۰۷۔ (۱۲) ایضاً، ص ۳۰۸، ۳۰۹۔ (۱۳) ایضاً، ص ۳۰۹۔ (۱۴) ایضاً، ص ۳۱۰۔ (۱۵) ایضاً۔ (۱۶) ایضاً، ص ۳۱۲۔ (۱۷) ایضاً، ص ۳۱۴، ۳۱۳۔ (۱۸) ایضاً، ۳۱۱، ۳۱۲۔

اخبار علمیہ

''حافظات کا عالمی مقابلۂ قرأت''

خواتین کے حفظ قرآن کا بین الاقوامی مقابلہ دبئی کلچرل اینڈ سائنٹفک ایسوسی ایشن کی جانب سے ۲۰۱۶ء میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایوارڈ ''مادر عرب امارات شیخہ فاطمہ بنت مبارک'' کے نام سے منسوب ہے۔اس بار اس مقابلہ میں چھیاسی ممالک کی نمائندہ حافظات نے شرکت کی۔ ملیشیا کی نوعمر حافظہ روضہ بنت عبدالرزاق نے اس مقابلہ میں اول، امارات کی فاطمہ راشد سالم السویدی نے دوم، کویت کی رویٔ محمد مہدی نے سوم، کیمرون کی حواء محمد نے چہارم، سیرالیون کی حسینہ جالو نے پانچواں انعام حاصل کیا، ان کے علاوہ انگلینڈ کی حلیمہ عبدالناصر، فلسطین کی اسیل علی محمد ابوصلاح، جنوبی افریقہ کی امینہ ہنڈرکس، امریکہ کی عود محمد صلاد، عمان کی زینب بنت سلیمان بن سعید الکیملیہ، تیونس کی فاطمہ بنت فوزی المعالج، موریطانہ کی حفصہ محمد عثمان، سنگال کی سخنہ خدی دارمی، الجزائر کی حلیمہ مردا، نائجیریا کی عائشہ محمد امین بالترتیب بعد کے انعامات کی مستحق قرار پائیں۔ پہلی پوزیشن حاصل کرنے والی حافظہ کو ڈھائی لاکھ، دوسری کو دو لاکھ، تیسری کو ڈیڑھ لاکھ، چوتھی کو ۶۵ ہزار، پانچویں کو ۶۰ ہزار، چھٹی کو ۵۵ ہزار، ساتویں کو ۵۰ ہزار، آٹھویں کو ۴۵، نویں کو ۴۰/ اور دسویں کو ۳۵ ہزار درہم کی رقوم بطور انعام دی گئیں۔ انعامات کی کل رقم ساڑھے نو لاکھ درہم ہوتی ہے جس میں دوسرے انعامات بھی دیے گئے۔ اختتامی تقریب میں بعض مصنّفین اور منتظمین کو بھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ امارات کے ادارہ امور کی خواتین کی ڈائریکٹر نورہ خلیفہ السوید سمیت دیگر دانشور خواتین، حاکم دبئی کے مشیر اور مقابلوں کے انچارج ابراہیم محمد بوملحہ اور دوسرے اعلیٰ حکام اور طالبات کی بڑی تعداد اس تقریب میں شریک تھی۔ محترمہ امینہ الدبوس نے اپنے خطاب میں کہا کہ خواتین مقابلوں کی رونق میں سال بہ سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ بہت خوش آئند بات ہے۔اس سے قرآن مجید کے تئیں خواتین کے حفظ و قرأت قرآن کا ذوق بڑھ رہا ہے۔ اختتامی پروگرام میں انگلینڈ کی حلیمہ عبدالناصر اور کومور کی طالبہ کی تلاوت کے بعد شیخہ فاطمہ کی تاریخ پر مشتمل ڈاکومنٹری کی نمائش بھی کی گئی۔ (منصف روزنامہ حیدر آباد، ۱۶/ نومبر ۲۰۱۹ء، ص ۸)

''پرندوں کی بولی نصابِ درس میں داخل''

اقوام متحدہ کے ادارہ یونیسکو نے ''پرندوں کی بولی'' کے تحفظ کے لیے ترکی حکومت کے ساتھ ایک مشترکہ منصوبہ شروع کردیا ہے۔اس کے تحت ترک وزارت تعلیم اور وزارت ثقافت نے ۲۵۱ لفظوں اور جملوں پر مشتمل اس ''پرندہ بولی'' کا نصاب تیار کر کے یونیسکو کی منظوری سے اپنی یونیورسٹیوں میں داخل کیا ہے۔اس کے علاوہ حکومت نے ماہرین کی تعداد بڑھانے کے لیے سال میں دوبار ''کاسکوئے فسٹیول'' کے انعقاد کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ترک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں پہلے مرحلہ میں ملکی اور غیر ملکی سینکڑوں امیدواروں کی جانب سے درخواست واگزاری کی تصدیق بھی کی جاچکی ہے جو سیٹی کی مدد سے رابطہ کے اس انوکھے طریقہ کار کو سیکھنا چاہتے ہیں۔وزارت ثقافت کا کہنا ہے کہ پرندوں کے انداز میں استعمال کی جانے والی یہ سیٹی نما زبان وہاں کئی صدیوں سے بولی جارہی ہے،سلطنت عثمانیہ کے پانچ سو سالہ قدیم مخطوطات اور دستاویزات سے علم ہوتا ہے کہ یہ بولی اس وقت سے یہاں رائج تھی۔ بحر اسود علاقہ کے ترک پہاڑی دیہات کا نام ''کاسکوئے'' یعنی پرندوں کا گاؤں اسی لیے پڑا تھا کہ یہاں لوگ پرندوں کی بولی یا سیٹی کا خوب استعمال کرتے تھے۔جب مقامی باشندے سیٹی کی صورت میں بولتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے پرندے چہچہارہے ہیں۔اس فن کی سب سے زیادہ ماہر معمر خواتین ہوتی ہیں ۔ یونیسکو کی جانب سے پرندوں کی بولی کو عالمی ثقافتی ورثہ ٹھہرایا گیا ہے جب کہ ترک حکومت کی جانب سے اس کے تحفظ کے لیے لاکھوں ڈالر کا پروگرام مرتب کیا گیا ہے،رپورٹ میں ہے کہ کاسکوئے سے تعلق رکھنے والے مرد وخواتین اس بولی کو پڑھائیں گے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ صدیوں پہلے یہ بولی نظریہ ضرورت کے تحت وجود میں آئی۔ابتدائی دور میں سیٹی کی دو یا تین قسمیں ایجاد کی گئیں جس میں زوردار اور طویل سیٹی کا مطلب آپ کی فوری ضرورت،کم تر سیٹی کا مطلب سلام یا باہمی خیر وعافیت اور جواب دینے والا اس سے کم تر سیٹی اس لیے بجاتا تھا کہ وہ بھی بخیر وعافیت ہے۔کسی مقام پر اپنی موجودگی بتانے کے لیے مخصوص سیٹی بجائی جاتی ہے۔معلوم ہوا یہ سیٹی نہیں بلکہ ایک مکمل زبان ہے جس کو ابتدائی مرحلہ میں شمالی ترکی کے اسکولوں میں سیکھا بلکہ اس پر مخصوص ترک یونیورسٹیوں میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی لی جاسکتی ہے۔شمالی پہاڑی گاؤں میں باہمی

رابطہ اور پیغام رسانی کے لیے مخصوص سیٹی کا استعمال معمول کی بات ہے۔ چیخ کر یا کوئی لفظ یا جملہ ادا کرنے کے بجائے سیٹی بجا کر باہم سلام وکلام اور ضروری اشیا کا لین دین کیا جا سکتا ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی شمالی ترکی کے بیشتر دیہی عوام موبائل، ٹیلی فون یا وائرلیس کا استعمال نہیں کرتے، آپس میں پرندوں کی سریلی زبان میں گفتگو وہاں رائج ہے۔ یونیسکو نے اس بولی کو ثقافتی ورثہ قرار دینے سے قبل ۲۰۱۷ء میں اسے بولنے والے افراد کا امتحان بھی لیا تھا کہ ایک پیغام کو کتنے لوگ سمجھ اور اسی زبان میں جواب دے سکتے ہیں۔ سماجی رابطوں کی ویب سائٹس پر حکومت کی جانب سے جاری کی جانے والی ویڈیوز دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ یہ انسان ہیں جو آپس میں محو گفتگو ہیں یا پرندے چہچہا رہے ہیں۔ (منصف، حیدرآباد، ۳۰ر دسمبر ۲۰۱۷ء ص ۸)

"چارٹاپ ایپ"

سوشل میڈیا انالیٹکس فرم ایپ، اینی کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں سب سے زیادہ ڈاؤن لوڈ کیے جانے والے ایپوں میں فیس بک، میسنجر، واٹس ایپ، انسٹا گرام، اسنیپ چیٹ، اسکائپ، ٹک ٹاک، یوسی براؤزر، یوٹیوب اور ٹوئیٹر ہے۔ لیکن ۲۰۱۰ء سے ۲۰۱۹ء کے بیچ سب سے زیادہ ڈاؤن لوڈ کیا جانے والا ایپ فیس بک ہے۔ رپورٹ میں یہ بات خاص طور پر کہی گئی ہے کہ اس عشرے کے سب سے اوپر اایپوں میں چار فیس بک کے پاس ہیں۔ میسنجر اس نے خود تیار کیا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں اس نے انسٹا گرام کا سکہ جمایا۔ ۲۰۱۴ء میں واٹس ایپ کو ۱۹؍ بلین ڈالر میں خرید لیا۔ واضح رہے کہ یہ سارے ایپ صارفین کو مفت فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ اشتہار ہے۔

(روزنامہ ہندوستان (ہندی)، وارانسی، ۲۳/ ۱۲/ ۲۰۱۹ء، ص ۱۶)

(ک۔ ص اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب بنگلور

محترمی ومکرمی! السلام علیکم۔

خیریت مزاج گرامی۔

دیگر عرض یہ کہ احقر (راہی فدائی) کا مضمون معارف ماہ دسمبر کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے، شکریہ وجزاکم اللہ۔ اس کی اطلاع راقم کو کل رات تقریباً ۹ بجے ایک خاتون کے واٹس اپ آڈیو کال سے ہوئی، وہ محترمہ تہران (ایران) سے کال کررہی تھیں، انہوں نے معارف کا تازہ شمارہ دیکھا اور راقم کے مضمون پر مبارک باد کے جملے ادا کیے، موصوفہ نے اپنا نام ڈاکٹر لیلیٰ بتایا اور وہ جنوب کے قدیم سفرناموں سے متعلق دریافت کررہی تھیں، ڈاکٹر صاحبہ سے گفتگو کرکے یہ احساس ہوا کہ معارف کی شہرت آج بھی عالمگیر ہے۔ اس سے پیشتر بھی احقر کا تجربہ ہوا تھا۔ گذشتہ معارف کے کسی شمارے میں راقم کا مضمون ''ردعیسائیت میں علمائے جنوب کی خدمات'' شائع ہوا تھا، امریکہ کے کسی شہر سے ٹیلیفون کال آیا تھا اور انہوں نے معارف کا حوالہ دے کر مضمون کی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا، بہرحال معارف کی وقعت ووسعت کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سرچشمۂ علم وعرفان کو ہم جیسے تشنہ گان ادراک و آگہی کے لیے ہمیشہ جاری رکھے اور اس رسالہ کو نظر بد سے بچائے اور اسے مزید ترقی وترویج سے ہمکنار کرے۔ آمین

نوٹ: براہِ کرم مذکورہ بالا دونوں شمارے احقر کے لیے ذیل کے پتے پر روانہ فرمادیں۔

نوازش ہوگی۔

احقر

راہی فدائی

Dr. Rahi Fidai
H-No.218, Ground Floor,
2nd B-Cross, H.B.R. 4th Block
Banglore - 560043

مکتوب علی گڑھ

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دسمبر کے شمارے میں پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی صاحب مرحوم پر ''وفیات'' کے تحت تعزیتی تحریر نظر سے گزری۔اس میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شخصیت کی نسبت سے مرحوم کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ نے قلبِ سلیم اور دیدۂ بینا عطا کیا ہے تو سب سے زیادہ متاثر کرنے کے لائق تو تاریخِ عالم میں بس ایک ہی شخصیت گزری ہے: حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، یہ نری عقیدت نہیں ہے، تاریخی حقیقت بھی ہے۔تاریخِ عالم کوئی دوسری ایسی شخصیت پیش کرنے سے قاصر ہے جو دین و دنیا کی اسی طرح جامع ہو جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے'' (دھوپ چھاؤں/پیش لفظ، ص۵-۶) اسی ضمن میں یہ ذکر برمحل معلوم ہوتا ہے کہ دہلی سے شائع ہونے والا معروف رسالہ ''اردو بک ریویو'' کے مدیرِ محترم نے ''کتابِ زندگی'' کالم کے لیے ۲۰۱۰ء میں پروفیسر شروانی صاحب کو متعدد سوالات ارسال کیے تھے۔ان میں ایک سوال یہ بھی تھا: وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟ اس کے جواب میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا: ''الحمدُ للہ تقریباً ہر روز قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہوں''، (اردو بک ریویو، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۰ء، ص۲۰) اسی کے ساتھ پروفیسر شروانی صاحب زبانی طور پر اور اپنی تحریروں میں بھی بار بار اس پر زور دیتے تھے کہ قرآن کریم کو سمجھ کر پڑھا جائے اور اس کی ہدایات کو روز مرّہ زندگی میں دخیل بنایا جائے۔ناچیز یا دوسروں کے قرآنی مضامین پڑھتے یا قرآنی کتب پر تبصرہ کرتے تو بار بار یہی تاثر ظاہر کرتے تھے کہ ان سب کی افادیت صحیح معنوں میں اسی وقت ہوگی جب لوگ قرآنی احکام و تعلیمات کو عملی جامہ پہنائیں۔ناچیز کی کتاب ''قرآنی مطالعات''

پر تبصرے میں قرآن مجید سے استفاضہ کی صورتیں واضح کرتے ہوئے مرحوم نے یہ تحریر فرمایا تھا: ’’پہلا مرحلہ ہے قرآن کو پڑھنا، دوسرا اسے سمجھنا اور پھر اس کی تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبہ میں داخل یا نافذ کرنا۔‘‘ (کانفرنس گزٹ، جولائی ۲۰۱۴ء، ص ۲۸)

مذکورہ بالا تعزیتی تحریر میں مرتبِ محترم نے بجا طور پر یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ ’’جس چیز نے ان (پروفیسر شروانی صاحب) کو فخرِ خانوادۂ شروانی بنایا وہ قرطاس و قلم سے ان کی گہری وابستگی اور اس سے بھی زیادہ حرمتِ قلم کی پاسداری ہے‘‘۔ واقعہ یہ کہ جب تک بصارت نے ان کا ساتھ دیا کتب و رسائل و اخبارات کے مطالعہ کا مشغلہ برابر جاری رہا، ادھر وفات سے چار پانچ ماہ قبل قوتِ بصارت تقریباً ساتھ چھوڑ گئی تھی، سماعت بھی مزید متاثر ہوتی چلی گئی، تب بھی اللہ کے فضل و کرم سے ذہن و حافظہ کام کرتا رہا، ملاقاتیوں سے خیر و خیریت معلوم کرنے کے علاوہ ملّی و ملکی مسائل پر گفتگو بھی کرتے اور ہر ماہ اپنے جاری کردہ رسالہ ’’فکرِ نو‘‘ کے اداریہ کے لیے کوئی عصری مسئلہ یا اہم معاملہ خود سوچ کر یا کسی کے توجہ دلانے پر منتخب کر لیتے اور اسی پر پورا اداریہ املا کرا دیتے۔ نومبر ۲۰۱۹ء کا پورا شمارہ تیار ہو گیا تھا، پرنٹر (جناب سجاد صاحب) اداریہ کے لیے دو تین بار حبیب منزل گئے، لیکن بار بار کوشش کے باوجود مدیر گرامی صاف طور پر بول نہیں پا رہے تھے (۲۹/ اکتوبر کو اس راقم عاجز نے بھی اس تشویش ناک صورتِ حال کا مشاہدہ کیا تھا)، اسی کیفیت میں وہ تین چار روز رہے کہ وقتِ موعود آ گیا۔ كُلُّ مَنۡ عَلَيۡهَا فَانٍ وَّيَبۡقٰى وَجۡهُ رَبِّكَ ذُو الۡجَلٰلِ وَالۡاِكۡرَامِ۔ حقیقت یہ کہ محترم شروانی صاحب مرحوم نے بھرپور علمی زندگی بسر کی، آخر وقت تک کسی نہ کسی صورت میں علم کی خدمت میں مصروف رہے۔ آپ نے بہت صحیح لکھا ہے: ’’حیرت ہوتی ہے کہ عمر کی ان منزلوں پر جہاں سانسیں بھی آہستگی کا تقاضا کرتی ہیں وہ فکر و دانش کی سچائیوں کا عرق کشید کرتے رہے‘‘۔

پروفیسر شروانی مرحوم کی روزمرّہ زندگی کو برسہا برس قریب سے دیکھنے اور ان کی نگارشات سے استفادہ کا موقع نصیب ہوا۔ ان کی شخصیت اور علمی زندگی کے جو گہرے نقوش ابھر کر سامنے آتے ہیں انہیں مختصراً اس طور پر بیان کیا جا سکتا ہے: رئیسانہ یا نوابی خاندان سے تعلق کے باوجود سادگی و تکلفات سے دوری، چھوٹے بڑے سب سے خوش دلی سے ملاقات، کتب، مضامین، اداریوں، تبصروں،

استدراکات ومکاتیب کی صورت میں تحریری صلاحیتوں کا بھرپور استعمال، پیرانہ سالی کے باوجود (جب تک بصارت ساتھ دیتی رہی) کتب ورسائل کے مطالعہ، اخبار بینی کی پابندی اوران پر جگہ جگہ تحسینی یا تنقیدی ریمارکس، اسلامی ومشرقی علوم میں مہارت کے ساتھ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر، صحت مند تنقید کی روایت کی پاسداری، فکرانگیز اداریے اور کتابوں پر بے لاگ وحقیقت پسندانہ تبصرے، ملک و ملت کے مسائل میں گہری دلچسپی اوران پر بے باکانہ اظہارِ خیال، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور دوسرے ملّی اداروں کی فلاح وبہبود کے لیے فکرمندی وکوشش، دینی مدارس اور علمی وتحقیقی اداروں سے ربط وتعاون اور نہایت پابندی سے معروف مدارس کی مالی اعانت کا اہتمام، ملت و ملک کی عزت وآبرو کو ٹھیس پہنچانے والے واقعات پر بے چینی واضطرابی کیفیت کا زبانی وتحریری اظہار، اہلِ وطن میں باہمی اتفاق واتّحاد اور خوش گوار تعلقات کی شدید خواہش اور تحریروں میں اس کی پُرزور وکالت، خوردوں سے بے تکلفانہ محبت اوران کی علمی تربیت وحوصلہ افزائی، اپنی مختلف النوع منتشر نگارشات کو کتابی صورت میں مرتب ومحفوظ کرنے کا اہتمام، حیاتِ مستعار کے آخری مراحل میں قوتِ سماعت وبصارت کے حد درجہ کمزور ہوجانے کے باجود کسی نہ کسی صورت میں علمی خدمت کی انجام دہی۔

یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ ریاست اور نوابی خانوادۂ شروانی کو وراثت میں ملی تھی، لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی مرحوم نے اپنے دادا محترم کے مثل اللہ رب العزت کی عطا کردہ ذہنی وعلمی صلاحیتوں کو صحیح رخ پر بھرپور استعمال کیا اور وہ علمی ریاست کے مالک بن گئے، جیسا کہ زیرنظر تحریر میں بھی اس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی کا فیض ہے کہ انھوں نے متعدد ضخیم کتابوں اور پُرمغز مضامین کا ایک بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جس سے ان شاء اللہ تعالیٰ شائقینِ علم کو فیض پہنچتا رہے گا۔ امید کہ مرحوم کی علمی یادگاروں کے فیض یافتگان انہیں دعائے مغفرت کا نذرانہ پیش کرتے رہیں گے۔ رب اغفر وارحم وانتَ خیر الرّحمین۔ آمین ثم آمین۔

والسلام

ظفر الاسلام اصلاحی

اسلام منزل، اقرأ کالونی، علی گڑھ

وفیات

ڈاکٹر مظفر احسن، مرزا اشفاق بیگ اور حفیظ نعمانی رحمہم اللہ

گزشتہ دنوں ملک وملت چند ایسی ہستیوں سے محروم ہوگئی جو بظاہر ان نگاہوں سے دور تھیں جو شہرت کی بلندیوں پر ٹکی رہتی ہیں، لیکن حقیقت میں ان کا وجود ان کے ارد گرد خدمتوں کے اعتراف اور مقبولیت کا بڑا روشن ہالہ بنائے رکھتا ہے، ایسی ہی ایک شخصیت ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی کی تھی، سرسید، شبلی، علی گڑھ اور اعظم گڑھ کی نسبتوں سے ان کے علم وتجزیہ کا جوش وفوران کی خطابت کو عجب شان عطا کرتا رہتا تھا، اسی طرح ایک اور نہایت سادہ اور مشفق ہستی مرزا اشفاق بیگ اصلاحی کی تھی، وہ مدرسۃ الاصلاح کے ناظم تھے، لیکن کبھی ان کے کسی عمل سے عہدۂ نظامت کا اظہار نہیں ہوا لیکن ان کی بے تکلفانہ اور بیباکانہ گفتگو ان بزرگوں کی یاد دلاتی جن کو کبھی علم وزہد وتقویٰ کا پندار نہیں رہا، یہ وہ بزرگ تھے جو چھوٹوں کو کچھ دیر ہی کے لیے سہی، بڑے پن کا احساس دلا جاتے تھے، ایسے کم نام لیکن غیر معمولی طور پر مقبول انام افسوس ہے کہ کم سے کم ہوتے جاتے ہیں۔

ایسی ہی بلکہ شہرت میں کہیں زیادہ شخصیت جناب حفیظ نعمانی کی تھی، ستر کی دہائی میں وہ آسمان صحافت کے روشن ستارہ میں نمودار ہوئے، مولانا منظور نعمانیؒ کے صاحبزادے اور خالص علمی ودینی خانوادہ کے نمایاں ترین فرد ہونے کے باوجود وہ کچھ الگ سے تھے، کبھی ان کی خوش باشی کے چرچے تھے لیکن ملی فکر ان کی صحافت کی شناخت بن گئی، یقیناً اردو صحافت کی آبرو کہے جانے کے مستحق ہوئے، معصوم مرادآبادی نے اپنے صحافتی تجربہ کی بنیاد پر اگر یہ کہا تو بالکل درست کہا کہ کلدیپ نیر کے بعد وہ ہندوستان کے سب سے بڑے صحافی تھے، ۶۵ء میں ندائے ملت کا مسلم یونیورسٹی نمبر نکلا، ایڈیٹر تو آصف قدوائی تھے لیکن اس خاص شمارہ کی بے مثال کامیابی حفیظ نعمانی مرحوم کی مرہون منت تھی، اس رسالہ کی اشاعت کے بعد جوان پر گزری، وہ کیسے پابند سلاسل ہوئے، اس کی تفصیل اس روداد قفس سے ملتی ہے جس کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ صحافیانہ عزم وجرأت کی ایسی رودادیں بہت کم ہیں، بعد میں وہ خاموش وگوشہ گیر ہوگئے لیکن ادھر جب انہوں نے ملک میں فسطائیت کے خوفناک چہرہ کو نمایاں ہوتے دیکھا تو پھر ان کے قلم نے کروٹ لی اور اب ان کے چھوٹے چھوٹے آرٹیکل سیاسی بصیرت اور جوش کے ساتھ ہوش کا نمونہ بن گئے، وہ مقبول ہوتے گئے، ان کی تحریریں متعدد اخبار نقل کرتے رہے، سب خوش تھے کہ ان کا قلم پہلے سے زیادہ توانا ومتحرک ہے، افسوس اب ہمیشہ کے لیے صریر خامہ خاموش ہوگیا، ذاتی لحاظ سے ان میں وہ ساری خوبیاں تھیں جن کو دیکھ کر ملنے والا خوش ہوکر لوٹتا، ایک ذرا سی فرمائش پر انہوں نے مسلم یونیورسٹی نمبر کی دو کاپیاں بھجوادیں، اللہ تعالیٰ ان تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ملت کو ان ہی جیسے باعمل، بامقصد اور باکمال افراد سے آباد رکھے۔ (ع۔ص)

باب التقریظ والانتقاد

پاکستان سے چند جدید علمی مطبوعات۔٦

☆ڈاکٹر عارف نوشاہی

پروفیسر محمد اقبال مجدّدی کی نئی کتب: راقم السطور کا سلسلہ مضامین ''پاکستان سے چند جدید علمی مطبوعات'' جو معارف کے گذشتہ شماروں میں وقتاً فوقتاً چھپتا رہا ہے، اس میں پاکستان سے پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب کی تالیف و تحقیق و مقدمہ سے چھپنے والی کتب کا بھی اکثر ذکر ہوا ہے۔ وہ بزرگ سالی کے باوجود کتب کی اشاعت میں مسلسل منہمک اور مصروف ہیں۔ گذشتہ ایک سال میں ان کے اہتمام سے اتنی کتب شائع ہو چکی ہیں کہ ان کے تعارف کے لیے میرا راہوار قلم تھک کر پیچھے رہ گیا ہے اور میں بروقت ان پر تقریظ و تنقید نہیں لکھ سکا۔ ان کی تحقیقات کا محور و مرکز سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ اور اس کے رجال و مصنّفین ہیں۔ اپنے اس مرغوب موضوع پر انھوں نے زندگی بھر جو مصادر قلمی نسخوں یا ان کے عکسیات کی صورت میں جمع کیے، اب وہ انھیں ایک ایک کر کے اپنی مقدماتی اور تعارفی تحریروں کے ساتھ فیکسے میل (Facsimile) شائع کر رہے ہیں۔ چونکہ یہ سب کتب اہم ہیں اور ہندوستان کے علمی حلقوں میں بھی اپنے مخاطب رکھتی ہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ کم از کم ان کتب کی اشاعت کی اطلاع سطور ہذا کے ذریعے دے دی جائے۔ ان پر تفصیلی تبصرہ و تنقید کا یہ وقت نہیں ہے۔ کتب کا تذکرہ الفبائی ترتیب سے کیا گیا ہے۔

ارمغان امام ربانی، جلد دہم: پاکستان میں ہر سال مجدّد الف ثانی کانفرنس (۲۶ اکتوبر) کے موقع پر ایک کتابی سلسلہ ارمغان امام ربانی شائع کیا جاتا ہے۔ ۲۰۱۹ء کی کانفرنس کے موقع پر اس سلسلے کی جلد دہم (مرتبہ ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس) شائع ہوئی ہے۔ اس جلد کا ایک حصہ مجددی صاحب کی تحقیقات پر مشتمل ہے جس میں ان کے کچھ مقالات اور چند قلمی رسائل کے عکس ان کے مقدمے کے ساتھ شائع ہوئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

☆ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد۔

رسالہ دراذکار یومی و لیلی از خواجہ محمد معصوم سرہندی، فارسی۔وثیقۃ الاکابر از شاہ فقیر اللہ علوی شکارپوری، عربی۔عقائد ضروریہ از شاہ محمد غوث لاہوری، فارسی۔سلسلۃ الاولیا از محمد صالح کنجاہی، فارسی، یہ مشائخ کا تذکرہ ہے۔زبدۃ الفرائض از غلام محی الدین قصوری، عربی۔نظامیہ از غلام محی الدین قصوری، فارسی۔ثمرات الحیات (ملفوظات شاہ برہان الدین گجراتی راز الٰہی) مرتبہ عاقل خان رازی، یہ حیدرآباد دکن کے ایک پرانے مطبوعہ ایڈیشن کی دوبارہ عکسی اشاعت ہے۔

شائع کردہ: امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء۔

رسائل حافظ محمد صدیق لاہوری: حافظ محمد صدیق لاہوری (وفات: ۱۱۹۳ھ) خطیب مسجد وزیر خان لاہور کے حسب ذیل عربی اور فارسی رسائل کی عکسی اشاعت ہے۔سلك الدرر (عربی)، مدار الاسلام (عربی)، تحذیر الاخوان (عربی)، توضیح السنة فی توضیح البدعه (فارسی) بیان شروط الایمان و ارکان الایقان (فارسی)، درء التعسف عن ساحة عصمة یوسف (عربی)، هدیة امام للخطبا (عربی)۔

شائع کردہ: لجنہ لاحیاء المخطوطات الاسلامیہ، امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء۔

رسائل خواجہ خُرد: خواجہ عبیداللہ ملقب بہ خواجہ خرد (وفات: ۱۰۷۴ھ) بن خواجہ باقی باللہ کے فارسی اور عربی رسائل کی عکسی اشاعت ہے، حسب ذیل رسائل اس مجموعے میں شامل ہیں:

فوائح (عربی)، فوائح (فارسی)، پردہ برانداخت و پردہ کی شناخت (فارسی)، رباعیات وشرح رباعیات (فارسی)، رسالۂ سماع (فارسی)، بحر الحقائق (عربی)۔احوال و ملفوظات خواجہ خرد مرتبہ خواجہ سلام اللہ بن خواجہ خرد۔القول السدید (عربی) یہ رسالہ تسویہ تالیف شاہ محب اللہ الہ آبادی کی شرح ہے۔

شائع کردہ: لجنہ لاحیاء المخطوطات الاسلامیہ، امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء۔

روضۃ القیومیہ: خواجہ کمال الدین احسان مجددی سرہندی کے معروف فارسی تذکرہ روضۃ القیومیہ کے آخری دو ابواب کی عکسی اشاعت ہے۔یہ ابواب خواجہ محمد نقشبند ثانی اور خواجہ محمد زبیر سرہندی کے حالات و کرامات پر مشتمل ہیں۔

شائع کردہ: لجنہ لاحیاء المخطوطات الاسلامیہ، امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء۔

شمس التوحید و ہجو المقلدین: یہ حافظ غلام محمد عرف امام گاموں لاہوری (وفات: ۱۲۴۲ھ)

خطیب مسجد وزیر خان لاہور کی دو فارسی تصانیف کی عکسی اشاعت ہے۔پہلی کتاب تصوف اور دوسری اخلاقیات پر ہے۔اس کے ساتھ مرزا اکرم بیگ کی ایک فارسی مثنوی کو بھی شامل کیا گیا ہے جو ان کے اپنے معاشقہ کی داستان ہے۔چونکہ شاعر نے امام گاموں کے والد حافظ محمد صدیق لاہوری کا اس میں ذکر کیا ہے اس لیے اسے بھی اس مجموعے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

شائع کردہ: لجنہ لاحیاء المخطوطات الاسلامیہ، امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

مبلغ الرجال: خواجہ عبید اللہ ملقب بہ خواجہ کلاں بن خواجہ باقی باللہ کی تصنیف ہے جس میں فلاسفہ اور ملاحدہ کے عقائد بیان ہوئے ہیں۔آخر میں ہندوستان میں مغلیہ دور میں ملاحدہ کی تحریک پر عمدہ تبصرہ ہے۔مجددی صاحب نے اس پر ایک مفصل مقدمہ لکھا ہے اور ہندوستان میں ملاحدہ کی تحریک پر روشنی ڈالی ہے۔

شائع کردہ: پروگریسو بکس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۳۲۸ صفحات

یہ کتابیں اپنے آبا کی: یہ مجددی صاحب کے اندرون و بیرون ملک تمام سفرنامے ہیں۔بیرونی ممالک میں وہ ایران، افغانستان، انگلستان، جرمنی، ہندوستان، سعودی عرب اور ترکی جا چکے ہیں۔یہ عام طرز کا سیاحتی سفر نامہ نہیں ہے بلکہ علمی تحقیقات کے مصادر سے استفادہ اور جمع آوری کے لیے مجددی صاحب نے جو اسفار کیے، اس کی روداد ہے۔وہ کس طرح جوکھم اٹھا کر کتب جمع کرتے رہے اور بیرونی ممالک سے پاکستان منتقل کرتے رہے، کن کن علما اور محققین سے ملے، ان سے کیا گفتگو ہوئی، اس سب کا بیان ہے۔اس سفرنامے کے بعض حصے دلچسپ اور بعض دردناک ہیں۔دردناک اس اعتبار سے کہ سفر میں بھوک، پیاس اور تھکن کے باوجود انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور کتب تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی۔بعض اوقات کتابوں یا ان کے عکس کی قیمت اس قدر زیادہ تھی کہ جیب میں اتنے پیسے نہ ہوتے تو مقامی لوگوں سے قرض لے کر حاصل کیں لیکن کتابوں کے حصول سے دستبردار نہیں ہوئے، زندگی بھر کی ان مشقتوں اور کوششوں کے بعد انھوں نے جو ذخیرۂ کتب جمع کیا اسے چند سال پہلے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے حوالے کر چکے ہیں اور ان کے ذخیرۂ کتب میں موجود مطبوعات و مخطوطات و مصورات کی فہرست تین جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس سفرنامے کے مقدمہ میں وہ پنجاب یونیورسٹی کو کتابیں عطیہ کرنا اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کہتے ہیں۔

کتاب کے شروع میں مجددی صاحب نے اپنے رجحانات اور پاکستان کے مجموعی علمی ماحول پر بھی لکھا ہے اورانھیں اس ماحول میں جو تلخیاں برداشت کرنا پڑیں اس کی کہانی بھی بیان کی ہے،اپنے کچھ معاصرین کے نامناسب رویے پر تبصرہ کیا ہے۔ساتھ ساتھ ان معاصر محققین کا ذکر بھی کیا ہے جن سے وہ متاثر تھے اورانھی کے خطوط تحقیق پر چلنا شروع کیا۔

شائع کردہ: پروگریسو بکس، لاہور، ۲۰۱۹ء، ۵۳۰ صفحات۔

اس مضمون کی تکمیل کے طور پر مجددی صاحب کے اہتمام سے گذشتہ سالوں میں شائع ہونے والی چند کتب (عکسی اشاعت) کا بھی ذکر کیا جاتا ہے: ۲۰۱۷ء میں امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور کی طرف سے یہ متون شائع ہوئے:

۱۔رسائل خواجہ محمد ہاشم کشمی

۲۔بہجۃ النظار فی برأۃ الابرار: تالیف مخدوم محمد معین ٹھٹھوی۔

۳۔فضائل الباری فی مناقب حاجی دوست محمد قندھاری۔

۲۰۱۸ء میں امام ربانی پبلی کیشنز، لاہور کی طرف سے حسب ذیل متون شائع ہوئے:

۱۔مناقب مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی تالیف مخدوم عبداللطیف ٹھٹھوی۔

۲۔قران السعدین تالیف میاں محمد رفیع عباسی، یہ حاجی محمد سعید لاہوری (وفات:۱۱۴۵ھ) اور شیخ محمد مسعود دوابی خرقی کے حالات پر ہے۔

۳۔رسائل در انساب اولاد حضرت مجدد الف ثانی، اس میں دو رسالے ہیں، رسالۂ قاضی ثناءاللہ پانی پتی اور انساب الطاہرین تالیف شیخ محمد عمر مجددی۔

مجددی صاحب نے اب تک مجددیات پر جو کام کیا ہے اس کے بارے میں بھی ایک کتاب ۲۰۱۹ء میں شائع ہوئی ہے جس کا عنوان مجدد شناسی میں محمد اقبال مجددی کی خدمات ہے۔یہ محمد طاہر اشرف کی تالیف ہے اور اسے پروگریسو بکس، لاہور، نے ۲۲۰ صفحات میں شائع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ پروفیسر محمد اقبال مجددی صاحب کو لمبی عمر عطا فرمائے اور وہ اپنے نامکمل کام مکمل کر کے منظر عام پر لاسکیں۔

☆............☆

روضۃ المحبین: یہ نویں صدی ہجری کے ایک فارسی شاعر ابن عماد خراسانی کی فارسی تصنیف ہے۔ جس میں مصنف کی غزلیات اور کچھ عاشقانہ منظوم خطوط ہیں۔ اسے پہلی بار ۱۹۳۵ء میں ایرانی محقق سعید نفیسی نے تدوین کر کے تہران سے چھاپا تھا۔ اب اسے دو ایرانی نوجوانوں ڈاکٹر مرتضی چرمگی عمرانی اور حسن سعد آبادی نے مرتب کیا ہے اور مفصل مقدمے کے ساتھ شعبۂ فارسی دانشگاہ پنجاب، لاہور نے ۲۰۱۸ء میں شائع کیا ہے۔ جب راقم السطور نے یہ اشاعت دیکھی تو یاد پڑا ابن عماد کی عربی مخارج حروف پر ایک منظوم فارسی تصنیف خلاصۃ الترتیل کا قلمی نسخہ میرے اپنے کتب خانے میں موجود ہے کیوں نہ اسے بھی شائع کر دیا جائے۔ میں نے کتب خانے سے مخطوطہ نکالا، جھاڑا، پونچھا، ایران سے مزید قدیم ترین نسخے منگوا کر اسے مرتب کر دیا ہے۔ اس کی اشاعت مستقبل قریب میں متوقع ہے۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

سرسید احمد خاں کا مسلمانانِ اعظم گڑھ سے خطاب

(سرسید کی ایک نادر تقریر)

☆ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

سرسید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) نے ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام سے پہلے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور اپنی تعلیمی تحریک کے اغراض و مقاصد واضح کیے اور قوم سے تعاون کی درخواست کی۔اس سلسلہ میں اتر پردیش کے مشرقی اضلاع کا بھی انہوں نے دورہ کیا تھا۔ گورکھپور کے بعد وہ اعظم گڑھ پہنچے اور ۱۱/جولائی ۱۸۷۴ء کو مشن اسکول (ویسلی انٹر کالج شہر اعظم گڑھ) میں باشندگان اعظم گڑھ کے ایک منتخب جلسہ سے خطاب کیا۔ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۶-۱۹۱۲ء) اس وقت اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست تھے،انہیں نے اس جلسہ کا انتظام کیا تھا۔جلسے کی صدارت راجہ سلامت خاں نے کی۔ڈپٹی نذیر احمد نائب صدر تھے۔جلسہ کا آغاز صدر کے تمہیدی کلمات سے ہوا۔بعدازاں نائب صدر ڈپٹی نذیر احمد نے جلسہ کے مقاصد کی مختصراً وضاحت کی اور پھر کوکب الہند خان بہادر سرسید احمد خاں کو خطاب کے لیے مدعو کیا۔

اس جلسہ میں اعظم گڑھ کے باشندگان جس میں رؤسا اور شرفاء شریک ہوئے۔اس میں ان اشخاص کا جنہوں نے چندہ دیا تھا ان کے نام محفوظ رہ گئے ہیں۔ان کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جاتے ہیں تا کہ ہمارے عہد کے باشندگان اعظم گڑھ کو یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے کن آباء و اجداد نے تحریک علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور میں حصہ لیا تھا اور سرسید کی آواز پر لبیک کہا تھا۔نام اور چندہ کی تفصیل یہ ہے:

۱۔منشی محمد اکرام صاحب رئیس محمد آباد و کیل سرکار (۵۰۰/روپیہ) ۲۔مولوی نذیر احمد صاحب

☆رفیق اعزازی،دارالمصنّفین،اعظم گڑھ۔

ڈپٹی کلکٹر بہادر (۴۰۰/روپیہ) ۳۔منشی محمد خلیل صاحب تحصیلدار نظام آباد (۲۰۰/روپیہ) ۴۔شیخ توجہ حسین صاحب وکیل (۱۲۵/روپیہ) ۵۔شیخ حبیب اللہ صاحب، واسطے امور دینی کے (۱۲۵/روپیہ) ۶۔ مولوی سید محمد صاحب وکیل۔ برائے خرید جائداد (۱۰۰/روپیہ) ۷۔حاجی محمد ہدایت اللہ صاحب (۱۰۰/ روپیہ) ۸۔شاہ محمد اسد اللہ صاحب وکیل (۵۰/روپیہ) ۹۔راجہ سلامت خاں صاحب (۵۰/روپیہ) ۱۰۔ مولوی محمد امداد اللہ خاں صاحب انسپکٹر (۵۰/روپیہ) ۱۱۔منشی غلام حسین خاں صاحب پیش کار کلکٹری (۲۵/روپیہ) ۱۲۔منشی محمد رمضان خاں صاحب (۲۵/روپیہ) ۱۳۔بابو لال بہادر خاں صاحب رئیس سدھاری (۲۵/روپیہ) ۱۴۔منشی عبدالرحمن خاں صاحب محافظ دفتر بندوبست (۲۰/روپیہ) ۱۵۔منشی چھیدے لال صاحب سررشتہ دار کلکٹری (۲۰/روپیہ) ۱۶۔منشی الٰہی بخش صاحب محافظ دفتر (۲۵/ روپیہ) ۱۷۔منشی طالع یار خاں صاحب (۱۰/روپیہ) ۱۸۔منشی رام پرشاد صاحب سررشتہ دار فوجداری (۱۰/روپیہ) ۱۹۔شیخ محمد سلیم صاحب (۱۰/روپیہ) ۲۰۔ شیخ باب اللہ صاحب انگریزی نویس (۵/ روپیہ) ۲۱۔منشی علی حسین خاں صاحب گوداور چنگی (۵/روپیہ) ۲۲۔محمد شیر خاں صاحب (۵/روپیہ) ۲۳۔منشی گوہر علی صاحب محرر رجسٹری (۵/روپیہ) ۲۴۔منشی حفیظ اللہ صاحب وکیل (۵/روپیہ)۔

اس فہرست میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اور ماموں شیخ محمد سلیم پھریہا کا نام بھی شامل ہے۔ ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس جلسہ میں شریک ہونے اور چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ اعظم گڑھ کے بعض ہندو بزرگوں کے نام بھی درج ہیں۔

سرسید احمد خاں کی یہ تقریر بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انہوں نے تحریک علی گڑھ اور مدرسۃ العلوم کے قیام کے اغراض، اسباب اور مقاصد کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ معترضین اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دیے ہیں اور ان کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کے خطبات بڑے پراثر ہوتے تھے، انہیں موثر تقریروں میں سے ایک یہ تقریر بھی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے قوم کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ قومی ہمدردی کے وہ تمام جلوے جو سرسید کی ذات میں مستور تھے وہ سب اس میں آ گئے ہیں:

تقریر سرسید احمد خاں

”صدر انجمن ونائب صدر انجمن وتمام رئیسانِ اعظم گڑھ!

اول میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ مسافر کی درخواست کو قبول فرمایا اور اس وقت اپنے اوقات گراں بہا خارج کرکے یہاں جمع ہوئے لیکن میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ آپ سب صاحب اس بات پر غور کریں کہ میں نے آپ کو یہ تکلیف کیوں دی اور یہاں آپ سب صاحبوں کا جمع ہونا کس غرض سے ہے۔ اگر یہ جمع ہونا اور یہاں تکلیف کرنا اس لیے ہے کہ کچھ اپنی قوم کی بھلائی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے واسطے کوشش کریں تو شاید اس تکلیف سے زیادہ کوئی چیز راحت بخش نہ ہوگی، نہ صرف ہمارے لیے بلکہ آئندہ نسلوں اور نسلوں کی نسلوں کے واسطے۔

اس ضلع میں اکثر مسلمان رئیس ہیں اور ایک نہایت ہی خوش کرنے والی بات یہ ہے کہ خاص اس ضلع میں اور اس کے قریب گورکھپور و غازی پور جون پور میں اکثر ذی علم اور نامی آدمی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ اضلاع معدن علم و فضل تھے۔ یہاں کثرت سے ایسے گھرانے تھے جن کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر ایک خاندان میں ایک سے ایک اولوالعزم تھا اور ہر ایک کو اپنے علم و فضل کا دعویٰ ہوتا تھا، جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کے خوبصورت چہروں سے یہ امید ہوتی تھی کہ یہ اپنے باپوں سے بھی زیادہ نام آور ہوں گے، لیکن آج وہی ضلع اعظم گڑھ اور وہی ضلع گورکھپور اور غازی پور و جون پور ہے ہر ایک خاندان کا شخص اور ہر ایک متنفس اپنے باپ دادا کی لیاقت اور عزت اور شہرت کا خیال کرے اور پھر خود اپنی حالت پر غور کرے کہ کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہے، لیکن اس قدر خیال کر لینا بس نہیں ہے بلکہ اتنا اور بھی ان کو سوچنا چاہیے کہ اس وقت جو لوگ اچھے خاندانوں کے ہیں اور جن میں اس وقت کچھ علم دکھلائی دیتا ہے ان کو کچھ نہ کچھ ذریعہ اس علم کے حاصل کرنے کا ملا، ان کے باپ دادا اور مورث اکثر صاحب علم تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو گو خود علم نہ رکھتے تھے مگر علم کی قدر کرتے تھے اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی آرزو رکھتے تھے۔ بڈھے اور قریب المرگ جو اپنی نیکی اور علم سے ممتاز تھے ان کے اخیر وقت کی نصیحتوں اور ترغیبوں کا لوگوں میں کچھ اثر تھا، مگر باوجود ان سب ذریعوں کے ان خاندانوں کی تعلیم کا ایسا ابتر حال ہوگیا جیسا آپ دیکھتے ہیں۔ اب غور کرو آئندہ زمانہ کا اور سوچو کہ جو ذریعہ تمہاری تعلیم کا تمہارے مورث چھوڑ مرے تھے وہ تمہاری اولاد کے لیے بھی باقی نہیں ہے جو لوگ اچھے گھرانوں کے ہیں اور کسی قدر مقدور اور دولت بھی رکھتے ہیں وہ مجھ کو بتلائیں کہ کیا طریقہ ہے ان کے ہاتھ میں اپنی اولاد کو نیک اخلاق اور عمدہ تعلیم دینے کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کے پاس اب ایسا

ذریعہ نہیں ہے۔ بعض جو فضل الٰہی سے دولت مند ہیں وہ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ہم ذی مقدور ہیں، کسی ملاں یا مولوی کو نوکر رکھ کر اپنی اولاد کی تعلیم کر لیں گے، لیکن جس نے اولاد کی تعلیم کو نہیں جانا معاف کیجئے اپنی قوم کی تعلیم کی کچھ بھی قدر جانی ہوگی وہ کبھی اس رائے کو تسلیم نہ کرے گا۔ اولاد کی تعلیم و تربیت ہرگز دولت کے زور سے نہیں ہوسکتی۔ ایک بڑے سے بڑے راجہ اور بڑے سے بڑے نواب کو فرض کرلو، مگر یہ ہرگز ممکن نہیں۔ نہ وہ اس طرح سے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کر سکے، ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت ایک شخص نہایت ذی علم بھی ہے اور تجربہ بھی اس کا اچھا ہے، خیال بھی اس کے اچھے ہیں، مثلاً میں اس وقت صاف کہتا ہوں کہ مولوی نذیر احمد صاحب جو تمام علوم سے واقف ہیں اولاد کی تعلیم اور اس کی پرورش کے طریقہ کو بھی خوب جانتے ہیں۔ اولاد کی عمدہ تربیت کی قدر بھی ان کو خوب معلوم ہے اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں جس کی خدا عمر دراز کرے کافی طرز سے توجہ کی بھی ہے لیکن اولاد کی تعلیم صرف کتابیں پڑھا دینے سے تو نہیں ہوتی اور اب مولوی صاحب ہی مجھ کو بتلا دیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں اور کہاں تک وہ نفروں کی صحبت سے اپنے گھر پر اپنے لڑکے کو بچا سکتے ہیں۔ آخر وہ کہیں باہر کو جاوے گا، اس وقت ضرور ایک خدمت گار اس کے ساتھ ہوگا، مگر کیا وہ ایسا شخص ہوگا جس کے الفاظ اور عادتیں لڑکوں کی طبیعت میں نیک اخلاق پیدا کر سکیں۔ آخر لڑکوں کو تفریح طبع بھی ضروری ہے، جس میں پھر ان کو ماماؤں اور سائیسوں اور خدمت گاروں اور ان کے لونڈوں سے کام پڑتا ہوگا۔ بولنا چالنا بات چیت جو کچھ ہے سب انہیں نامہذب نفروں سے ہے، لڑکے جب بازاروں میں گذرتے ہیں اور وہاں دیکھتے ہیں کہ کمین قوم کے لڑکوں میں کوئی جھگڑا ہو رہا ہے تو اچھے اچھے خاندانوں کے لڑکے بھی اس کا تماشہ دیکھنے کو ٹھہر جاتے ہیں اور تماشہ کیا ہوتا ہے سوائے گالیوں اور وحشیانہ بدالفاظ کے جس کو لڑکے بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ بتلایئے کہ کیا تدبیر ہے ان سب خرابیوں سے اپنے بچوں کے بچانے کی۔ علم نہایت عمدہ چیز ہے اور انسان کے لیے بڑی ترقیوں کا ذریعہ ہے، لیکن اس کی خوبی اس وقت ہے جبکہ اس کے ساتھ تربیت بھی عمدہ ہو۔ اگر تربیت نہیں ہے تو علم سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر تربیت ہے اور علم نہیں تو بھی آدمی اپنی ترقی نہیں کرسکتا۔ ان دونوں چیزوں کا ایسا ساتھ ہے کہ اگر ایک نہیں تو دوسری بھی نہیں کے برابر ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے جس پر سب اہل ہند نہایت کم غور کرتے ہیں، وہ ایک اور چیز ہے اور تعجب نہیں

کہ اس کے بیان کرتے وقت مجھ کو دیوانہ بتلاویں اور وہ لڑکوں کی تندرستی اور صحت جسمانی ہے۔ قویٰ کو طاقت ور، ان کے دماغ قوی رکھنا، خراب خیالوں کو اس سے نکالنا، ان کی طبیعت کو تر و تازہ رکھنا، یہی اصل جڑ ہے جس سے آئندہ عمر میں انسان کا دل و دماغ نہایت قوی رہتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور باریک سے باریک خیال جو انسان پیدا کرتا ہے، وہ سب اس ابتدائی احتیاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب بتلاؤ کہ کس کے لڑکے اس طریقہ سے پرورش پاتے ہیں۔ ان کو بجز اپنے گھر میں پڑے رہنے کے اور کچھ کام نہیں ہوتا۔ ورزش کا عمدہ طریقہ ان کے لیے کوئی نہیں ہے۔ تفریح طبع کا کوئی عمدہ موقع ان کو نہیں ملتا جس سے بدن تندرست رہے، عقل بڑھے اور بالفرض اگر کسی خاص دولت مند نے اسباب میں کوشش بھی کی کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنے گھر پر نہایت احتیاط سے تیار کرے اور اس کی تربیت اور صحت جسمانی کے لیے ہر قسم کا اہتمام کرے۔ اگر چہ یہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن ہمارا پھر یہ سوال ہے کہ کسی خاص شخص کی ایسی کوشش سے ہماری قوم کو کیا فائدہ ملے گا۔ ہم نہایت خوش ہوں اگر ہماری کل قوم اسی طرح اپنی اولاد کو تعلیم کر سکے، لیکن یہ امکان سے باہر ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہماری قوم کی قوم ذلت سے نکلے اور پھر اپنی پہلی سی ناموری حاصل کرے اور یہ نہیں ہو سکتا جب تک کل قوم کی عام تعلیم و تربیت درست نہ ہو اور یوں ایک دو شخص فرض کر لو کہ ان کی تعلیم بھی اچھی ہو اور تربیت بھی اچھی ہو مگر ان سے قومی عزت نہیں ہو سکتی بلکہ جب تک عام قوم کی تعلیم و تربیت درست نہ ہو گی ان ایک دو آدمیوں کو بھی نہایت غیرت اور شرم کا مقام ہوگا جب کبھی کوئی ذکر آوے گا تو ان کی نسبت بھی یہی کہا جاوے گا کہ یہ بھی اسی قوم کے ہیں، تو حقیقت میں انہوں نے بھی باوجود اپنی عمدہ تعلیم و تربیت کے کوئی قومی عزت حاصل نہیں کی اور نہ کوئی اس طرح کی عزت حاصل کر سکتا ہے جب تک کہ تمام قوم درجہ بدرجہ ترقی نہ کرے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ ہماری قوم میں اب کوئی ایسا ذریعہ باقی ہے جس سے ہم امید کر سکیں کہ ہماری قوم تعلیم و تربیت میں ترقی کر سکے گی۔ جواب یہ ہوگا کہ نہیں تمام ہندوستان میں جس قدر مدارس مسلمانوں کے باقی تھے اور بعض بزرگوں کے نام سے ان کا کام چلتا تھا، جتنی خانقاہیں ان متبرک انسانوں کے نام سے قائم تھیں، جن کے نام کا اب تک بھی لوگ ادب کرتے ہیں، وہ اب سب برباد ہو گئیں، ایک باقی نہیں۔ شاہ عبدالعزیز جو دہلی کے ایک نامی بڑے نامی علماء میں سے تھے، ان کے خاندان میں اب تو کوئی بھی باقی نہیں ہے، لیکن جب باقی تھے تو ان میں بھی سوائے ایک دو کے اور کوئی

پڑھا لکھا نہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھ سے ان کے کتب خانہ کو دیکھا ہے جو بالکل مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے ماماؤں اور چھوکروں کو ان کتابوں کو بیچتے ہوئے دیکھا ہے اور ان کے خاندان میں کوئی اتنا نہ ہوا جو کتابوں کو بھی بچا سکتا، یہ تمام ان کی عمدہ کمائی اس طرح پر برباد ہوئی۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ دہلی میں ایک عمدہ اور قابل یادگار خانقاہ تھی۔ وہ تمام ہندوستان کی سجدہ گاہ بلکہ ملائک کی بھی سجدہ گاہ تھی، مگر اب دیکھو کہ بالکل بے چراغ ہے۔ تمام خانقاہ میں ایک متنفس بھی پڑھنے یا پڑھانے والا اب نہیں ہے۔ غرض تمام ہندوستان میں جو بڑے بڑے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم کے خیال کیے جاتے تھے ان کا اب یہ حال ہے۔

اس کے علاوہ بہت بڑا ذریعہ تعلیم کا گورنمنٹ کے کالج ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کی تعلیم پر بہت توجہ کی اور حقیقت میں جس قدر ہماری تعلیم پر ہندوستان میں گورنمنٹ نے توجہ کی شاید دنیا میں کوئی ایسی سلطنت نہیں ہے جس نے اپنی رعایا کی تعلیم کا ایسا اہتمام کیا ہو، لیکن میرا سوال یہ ہے کہ وہ سلسلہ اور وہ طریقہ تعلیم ہم مسلمانوں کی حالت اور ان کی تمام ضرورتوں کے لیے بھی کافی ہے یا نہیں؟ اگر ہے بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ تمام ہندوستان کے کالجوں میں کے مسلمان پڑھتے ہیں۔ اگر ان کالجوں میں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی اغراض کے لیے وہ کالج کافی نہیں ہیں اور میں اس تعداد کے دریافت کرنے کے واسطے شمال و مغربی اضلاع پر بس نہ کروں گا، بمبئی کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے کالجوں میں ۱۸/طالب علموں میں ایک طالب علم مسلمان ہے۔ اور اسکولوں میں ۱۳۱/میں سے ایک ہے۔ اب خیال کیجیے گا کہ یہ ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب سو میں تین مسلمان ہوں اور وہ بھی غالباً کسی رئیس اور نامی خاندان کے نہیں تو نہایت صاف دلیل ہے کہ ہماری تمام اغراض کے لیے گورنمنٹ کے اسکول و کالج کافی نہیں ہیں۔ میرے اس بیان سے یہ منشاء نہیں ہے کہ کوئی الزام گورنمنٹ پر لگایا جاوے، گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ تمام احکام اور تجویزیں جو وہ صادر کرے وہ اصول گورنمنٹ کے منشاء کے مطابق ہوں۔

ہمارے اغراض میں سے ایک مذہبی تعلیم ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی تعلیم میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو تو حقیقت میں وہ تعلیم ایک جسم بے جان کی مانند ہوتی ہے اور شاید گورنمنٹ کے کالجوں سے زیادہ تر مسلمانوں کو فائدہ نہیں ہوتا اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ گورنمنٹ کالجوں میں لڑکوں کو مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی

اور مذہبی تعلیم کسی طرح انگریزی کالجوں میں نہیں ہوسکتی، بلکہ گورنمنٹ حقیقت میں ایسا کر نہیں سکتی۔ اس کے کالجوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب قسم کے لوگ تعلیم پاتے ہیں اور ان سب کا درجہ مساوی ہے۔ پس گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے اور وہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ گورنمنٹ مذہبی تعلیم سے دست کش ہو۔ چنانچہ نہایت تعریف اور بے انتہا توصیف کے قابل ہے ہمارے گورنمنٹ کی یہ کارروائی نہ کہ جس طرح اس نے اپنے کالجوں میں اوروں کی مذہبی تعلیم کو داخل نہیں کیا، اسی طرح اس نے اپنے مذہب کو بھی علاحدہ رکھا۔

غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کا مذہبی تعلیم سے دست کش ہونا بالکل بجا تھا لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا گورنمنٹ کے کالج اور اسکول ہمارے اغراض کے لیے بھی کافی ہیں یا نہیں؟ اور جیسا ہم نے اوپر ثابت کیا ہے، ہم کو یقین ہے کہ وہ کافی نہیں ہے اور جب تک کسی کالج میں دنیاوی اور مذہبی دونوں قسم کی تعلیم نہ ہو اس وقت تک وہ مسلمانوں کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ انہیں حالات کے لحاظ سے ہم نے ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے جس میں مسلمانوں کو علوم دنیاوی کے ساتھ ان کی مذہبی تعلیم بھی دی جاوے اور ہر قسم کی تعلیم کا مناسب اہتمام کیا جاوے یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان یہ چاہے کہ میرا لڑکا مذہبی علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی استعداد حاصل کرے تو اس کو مدرسہ میں یہ موقع ملے، اگر کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ میرے لڑکے کو ایسی تعلیم دی جاوے جس سے وہ سرکاری نوکری کے قابل ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اس کو مل سکیں، یہاں تک کہ سول سروس پاس کرنے کا موقع بھی اس کو ملے تو یہ سب اغراض اس کالج سے حاصل ہوں۔ اگر کوئی شخص زمینداری کے کاروبار کے متعلق یا تجارت کے اصول کی تعلیم چاہے تو اس کو بھی موقع ملے۔ حاصل یہ کہ جب تک ہم ایسا ایک کالج نہ بناویں جس سے مسلمانوں کے تمام اغراض حاصل ہوں تب تک کوئی تدبیر مفید نہ ہوگی۔ ہر شخص کی ایک غرض اور ایک مدعا ہوتا ہے۔ غرضیں مختلف، ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ پس ہم کو ضرور ہے کہ سب باتوں کا انتظام ایک جگہ کریں۔

اب آپ صاحب ذرا اس بات پر غور کریں کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان کام ہے کہ جب تک تمام قوم مددگار نہ ہو اس وقت تک اس کا سرانجام نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک دو کی بات ہو تو خیر اس کو ایک بھگتے، جب قوم کی بات ہے تو کل قوم کو مدد کرنا چاہیے۔ ابھی اعظم گڑھ میں اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ تمام شہر کو کھانا پکا کر

دیوے، دیکھیے کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں، حالانکہ تمام شہر والے جب مصروف ہوتے ہیں تو ہر روز سب کو پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا اسی طرح جو کام ایک قومی کام ہے جب تک سب اس میں مدد دیں گے تب تک اس کا سرانجام نہ ہوگا اور اگر قوم نے مدد نہ کی اور چند آدمیوں کی کوشش تنہا کارگر نہ ہوئی تو یاد رکھو! سب ڈوبیں گے اور سب کے واسطے ذلت اور خرابی کے دن آرہے ہیں۔

میری عمر اب آخر ہونے آئی اور اب بہت زیادہ مجھ کو اپنی زندگی کی توقع نہیں ہے۔ اگرچہ اور کسی کو بھی نہیں ہے لیکن میں اپنی عمر کا بہت حصہ ختم کر چکا ہوں۔ ہماری قوم کے معزز آدمی آج کی میری یہ بات یاد رکھیں جو میں اس وقت کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم کو اس خراب خستہ حالت سے نکال سکتے ہیں، لیکن اگر اس وقت ہماری قوم متوجہ نہ ہوئی تو خوب یاد رکھنا چاہیے کہ چند روز بعد سب لوگ چاہیں گے کہ کچھ کریں مگر کچھ کر نہ سکیں گے۔

اگر کوئی نہایت دیندار ہے تو سوچے کہ جس وقت مسلمانوں کی ذلت و نکبت اس درجہ پر پہنچ جاوے گی جو اس وقت ایک گھسیارہ اور چمار کی حالت ہے تو کیا عزت ہوگی اسلام کی۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں ہے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کی خوبی سے واقف ہوں۔ اسلام اس کے پیروؤں کی صورتوں اور ان کے اخلاق اور ان کے مزاجوں اور ان کی حالت سے پہچانا جاتا ہے، جس وقت خدا نخواستہ یہ نکبت جو مجھ کو دکھلائی دیتی ہے ہماری قوم پر حاوی ہو جاوے تو اس وقت اسلام کے نہایت عمدہ طرفداروں کی کیا حالت ہوگی۔ نہایت افسوس ہے کہ ہم اس آنے والی آفت کے روکنے کے لیے اس وقت کچھ تدبیر نہ کریں جس کی خرابی بتدریج اب تک ہم دیکھتے آتے ہیں اور جس کی مثال پر آئندہ کی حالت کو نہایت اچھی طرح سے قیاس کر سکتے ہیں۔ کیا افسوس ہے ہم پر کہ آج ہم اپنے گھر میں آرام سے سوویں اور جو آفت ہماری اولاد اور ہماری قوم پر آتی ہوئی دکھلائی دیتی ہے اس کی کچھ فکر نہ کریں۔

یہ کام جس کا میں نے ذکر کیا صرف قوم ہی کی مدد پر منحصر ہے اور ایک نہایت عظیم الشان کام ہے۔ ہارون رشید جو ایک بہت بڑا نامور بادشاہ گذرا، یا اس نے یہ ارادہ کیا تھا یا مجھ ایک فقیر نے ہی یہ ارادہ کیا ہے۔ اس نے اپنے بے شمار خزانہ اور روپیہ پر بھروسہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس نے اس کو خرچ کیا، مگر یہ کام پورا نہ ہوا۔ میں ایک مفلس ہوں لیکن اپنی قوم پر بھروسہ کرتا ہوں اور اگر میری قوم میری مدد کرے تو جو کام ہارون رشید نے کیا تھا اس سے سو حصہ زیادہ کر سکتے ہیں اور ہماری اولاد اس کو

اس سے بھی زیادہ ترقی دے سکتی ہے۔

میں ابھی گورکھپور سے آتا ہوں۔ وہاں خاص ایک یہ خیال لوگوں کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ اگر علی گڑھ میں کالج قائم ہوا تو اس سے گورکھپور کو کیا فائدہ ہوگا؟ اس لیے انہوں نے خیال کیا تھا کہ اگر گورکھپور میں یہ کالج قائم ہو تو زیادہ مفید ہوگا، لیکن انہوں نے مطلق غور نہ کیا، ان ضرورتوں پر اور مشکلات پر جو قوم میں علم پھیلانے کے لیے ضروری ہیں۔ نہ اس خرچ کا کچھ خیال کیا جو ایسے کاموں میں ہونا چاہیے۔ کیا اسی طرح اعظم گڑھ، علی گڑھ، گورکھپور اور اور ضلعوں کے لوگ یہ چاہیں کہ ہر ایک ضلع میں وہ ایسا کالج قائم کریں تو کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

اس ضلع اور اکثر اضلاع میں اس وقت دو قسم کے مدارس موجود ہیں۔ ایک گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا مشنریوں کی طرف سے۔ ہم پوچھتے ہیں آپ لوگ اگر کوشش بھی کریں تو کیا کوئی ایسا اسکول یا کالج اپنے ضلع میں قائم کر سکیں گے جیسا گورنمنٹ اسکول یا جیسا مشنری اسکول۔ کبھی نہیں۔ گورنمنٹ اسکول کا خرچ بارہ سو یا ہزار آٹھ سو روپیہ ماہواری کے قریب ہوتا ہے، کیا آپ اس ضلع سے آٹھ سو روپیہ ماہواری کا چندہ کر لیں گے جو برابر وصول بھی ہوتا رہے گا اور کبھی کوئی اس میں عذر نہ کرے گا اور تمام عمر آپ کا اسکول اسی چندہ کے روپیہ سے جاری رہ سکے گا۔ کبھی نہیں، ممکن نہیں۔ گورنمنٹ پڑھانے کی چیزیں مہیا کرتی ہے جن میں اکثر چیزیں ولایت سے آتی ہیں۔ روز بروز نئی کتابیں چھپ کر مدرسوں میں چلی آتی ہیں، کیا اعظم گڑھ میں کوئی ان سب مراتب کو پورا کر لے گا۔

اس وقت فرض کرو کہ آپ ایک اسکول قائم کر بھی لیں لیکن اب بتلایئے کہ اس میں کون سی کتابیں پڑھائی جاویں گی، آیا وہی کتابیں جو اگلے زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مذہبی کتابوں میں ہم کو عذر نہیں ہے، بے شک وہی پڑھائی جاویں لیکن اور علوم کی نسبت بتلایئے کہ ان میں آیا اسی پرانی منطق و فلسفہ کی تعلیم ہوگی۔ وہ علوم اب کسی کام کے بھی نہیں رہے اور صرف ایک بات کی بات رہ گئی ہے جس زمانہ میں وہ علوم بہ کار آمد تھے اس وقت میں تھے، مگر اب بتلاؤ کہ ایک مولوی صاحب جو نہایت عمدہ فلسفی اور منطقی بن گئے، ان کو دنیا کا کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ بھلا اگر دنیا کی مفید تعلیم سے بھی مسلمانوں کو غرض نہ ہو، نہ سہی، حالانکہ یہ غلط ہے مگر خیر یہی بتلاؤ کہ اس مدرسہ سے دینی ترقی کیا ہوگی؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ مدرسہ ایسا ہوگا جس میں بڑے بڑے لائق محدث اور اصولی پیدا ہو سکیں گے۔ کبھی نہیں۔ کیا

کوئی ضلع اس لائق ہوسکتا ہے کہ جو اپنے ضلع کے تمام لوگوں کے لیے کافی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بندوبست کرسکے۔ کبھی نہیں۔ ضرور ہے کہ اگر ہم آسمان پر چڑھنا چاہیں تو اس کے لیے پہلے سیڑھیاں بناویں۔ یہ ہم قبول کرتے ہیں کہ ابتدائی مدرسہ ہر ضلع میں ہونا مناسب ہے، لیکن ان کی جڑ قائم ہونی چاہیے، کبھی کوئی شاخ سرسبز نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ اول ہم کو ایک بڑا خزانہ میٹھے پانی کا جمع کرنا چاہیے۔ اس میں سے پھر جس قدر نہروں کی ضرورت ہو نکالنی چاہئیں، لیکن بغیر اس خزانہ کے قائم کیے ایسی نہریں کیونکر نکل سکیں گی۔ کیا سوکھے تالاب میں سے تم نہریں نکالو گے۔

چندروز ہوئے کمیٹی نے ایک تجویز مشہور کی جس میں ان تمام علوم وفنون کی تصریح مندرج ہوئی ہے جو ہماری قوم کو پڑھائے جاویں گے، اس میں ہر قسم کی تعلیم قرار پائی ہے۔ ایک دنیاوی علوم کی، دوسری مذہبی علوم کی۔ دنیاوی علوم میں دو قسم کی تعلیم ہے، ایک قسم کی کل تعلیم انگریزی زبان میں ہوگی اور دوسری قسم میں اردو زبان میں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے بیٹے کو جس شاخ میں داخل کرنا چاہے داخل کرے اور یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دسویں برس سے اگر تعلیم شروع ہو تو بیسویں برس بالکل فراغت ہوجاوے گی۔ اگر کسی کی خواہش سول سروس پاس کرنے کی ہو تو وہ اسی وقت امتحان دے سکے گا۔ پہلا امتحان وہ بیس برس کی عمر میں دے سکے گا، اگر اس میں کامیاب نہ ہو تو پھر دوسرا امتحان اکیسویں برس دے گا۔ اگر اس پر بھی کامیاب نہ ہو تو وہ قسمت کی بات ہے اور مجبوری ہے۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ نے ایک سرکلر اس حکم سے جاری کیا ہے کہ جو بڑے بڑے معزز خاندان نوکری پیشہ ہیں ان کو چاہیے کہ پچیس برس کی عمر سے پہلے اپنی اولاد کو سرکاری نوکریوں کے سلسلہ میں داخل کردیں، ہم نے جو بیس برس کی عمر کا اندازہ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کا کیا ہے۔ اس کا منشاء یہ بھی ہے کہ اس تعلیم سے فراغت حاصل کرکے تین چار برس تک ان صیغوں اور محکموں کے قوانین اور ضوابط سیکھیں جن میں نوکری تلاش کرنا چاہتا ہے اور اطمینان سے نوکری حاصل کرنے کا بندوبست کرے۔

دوسرا درجہ ایسا مقرر کیا گیا ہے جس سے ہماری عام قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس درجہ میں انگریزی کا لٹریچر جس کو ادب کہتے ہیں اس قدر سکھایا جاوے گا جس سے عدالت کی کارروائی کا حرج نہ ہو۔ باقی تمام علوم وفنون اردو زبان میں پڑھائے جاویں گے، تاکہ ہماری قوم میں سے کوئی شخص ان علوم سے محروم نہ رہے اور اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب تمام علوم کی کتابیں ہماری زبان میں

ہوجاویں تو شاید ہم بڈھوں کو بھی ان سے فائدہ حاصل ہو اور آخر یہ ایک عام ذریعہ قوم میں علوم وفنون پھیلانے کا ہوگا۔

ہمارے ملک کے بعض انگریزی داں صاحبوں نے جو انگریزی کے زیادہ شائق ہیں، اردو میں عام علوم وفنون کی تعلیم پر اعتراض کیا ہے، لیکن میں ایک قول فیصل کہے دیتا ہوں کہ جب ہم نے یونانی علموں میں ترقی کی تو اس کا ذریعہ کیا تھا، یہی تھا کہ جو زبان ابراہیم کی نسل کی تھی اس میں ہم نے ان علوم کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ذریعہ ہماری قوم میں ان علوم وفنون نے یہاں تک ترقی پائی کہ اب تک بھی اس کا اثر بڑی سرگرمی کے ساتھ ہماری قوم میں موجود ہے۔ پس اسی طرح اگر ان علوم و فنون کا جو آج ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہیں اردو زبان میں ترجمہ ہو جو بے شبہ ایک شاخ ہے ہمارے بڑے باپ ابراہیم کی تو پھر وہی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اس سے زیادہ میں اپنے قول کی تائید میں ایک صاف مثال بیان کرتا ہوں۔ اس وقت جو انگریزوں کی قوم کو اپنے علم وفضل اور اپنی صناعی اور لیاقت پر بڑا فخر ہے، ان سے پوچھو کہ اگر وہ تمام علوم و فنون جن پر آج تم کو فخر ہے اگر انگریزی زبان میں نہ ہوتے تو کیا کبھی اس نتیجہ کے حاصل ہونے کی امید ہوسکتی تھی، کبھی نہیں۔

اب چلو فرانس میں، جرمن میں اور ان سے پوچھو کہ اگر تمہارے ہی ملک کی زبان میں تمام علوم موجود نہ ہوتے تو کیا تم یہ ترقی کر سکتے تھے جو آج تم کو حاصل ہے۔ جواب ملے گا کہ کبھی نہیں۔ رشیا یعنی روس کی زبان میں علوم وفنون کی ترقی بہت کم ہوئی، اس وقت اس زبان میں صرف چودہ سو کتابیں مختلف علوم کی ہیں، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ یورپ میں بہ نسبت اور قوموں کے تمام چیزوں میں اور علم و فضل میں پست ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تمام قوموں کے پچھلے حال پر اور موجودہ حالت پر غور کرنے سے بہت بڑا عمدہ نتیجہ نکل آتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم نے غیر علموں کو غیر قوموں کے علموں کو اپنی زبان کے ذریعہ حاصل کیا، اس نے ترقی پائی اور جس قوم نے اس میں جتنی کوتاہی کی اسی قدر اس کی ترقی میں کمی ہوئی۔ خدا کے فضل سے مسلمانوں کے لڑکے نہایت ذہین ہوتے ہیں۔ ان کا دل ان کا دماغ بہت اچھا ہوتا ہے۔ جب ان کو مختلف قسم کے علموں پر آسانی سے دست رس ہوگی تو امید ہے کہ وہ ان علموں میں اور بہت زیادہ ترقی اور باریکیاں دکھلائیں گے۔ یہی وجہ ہے جو دوسرے درجہ میں

ہر ایک قسم کے علوم وفنون جدید کا اپنی زبان کے ذریعہ سے پڑھانا تجویز کیا گیا ہے۔

تیسرا درجہ ہے تعلیم مذہبی کا اس میں کوئی چیز، کوئی شرط، کسی قسم کا انتخاب کتب مذہبی ہرگز کمیٹی خزینۃ البضاعۃ سے متعلق نہیں ہے جیسا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے اور جو لوگ یہ بیان کرتے پھرتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم کے واسطے کتب مذہبی کا کچھ انتخاب ہوگا، کچھ کچھ مطالب کتابوں کے کم کیے جاویں گے، کچھ جدید مسائل زیادہ کیے جائیں گے، یہ بالکل جھوٹ اور بالکل اتہام ہے اور حقیقت میں ایسے لوگ جو ایسی بے اصل خبریں مشہور کرتے ہیں، اپنی قوم کے، اپنے مذہب کے دشمن ہیں۔ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ میں بجز اس ایک فقرہ کے مذہبی تعلیم کی نسبت کبھی کچھ نہیں کہا گیا، نہ اصول وفقہ حدیث تفسیر پڑھائی جاوے گی۔ سنیوں کو مطابق مذہب اہل سنت و جماعت کے اور شیعوں کو مطابق مذہب شیعہ اثنا عشریہ کے اور اسی واسطے مذہبی تعلیم مدرسۃ العلوم میں سنیوں کے واسطے جدا قرار دی گئی ہے اور شیعوں کے واسطے جدا۔

حال ہی میں گورکھپور میں ایک مباحثہ ہوا۔ جو لوگ مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے انہوں نے کہا کہ ہاں تم یہ بات کہتے تو ہو کہ مذہبی تعلیم میں کچھ کمی بیشی نہ ہوگی، لیکن اگر تم آئندہ اس سے پھر جاؤ تو اس وقت کا کیا علاج ہے۔ ہم نے کہا کہ بابا! اگر تم چاہتے ہو تو ہم ایک اقرار نامہ لکھ کر رجسٹری کرا دیں، اگر اس پر بھی اطمینان نہ ہو تو پینل کوڈ کے بموجب جو سزا اس انحراف کے واسطے ہو سکتی ہو اس کے لیے ہم حاضر ہیں، لیکن اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں کہ تمہارے دل کا خطرہ کبھی موقوف ہی نہ ہو۔ اس وقت کمیٹی کے چونسٹھ ممبر ہیں۔ یہ مولوی منشی محمد اکرام صاحب بیٹھے ہیں یہ بھی ممبر ہیں، ان سے پوچھو کہ کیوں صاحب کیا تم بھی ایسے ہی رائے دیدو گے۔ منشی محمد خلیل صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب موجود ہیں جواب کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے ممبر ہونے والے ہیں ان سے پوچھیے کہ اگر میں کافر ہوں تو کیا یہ میرے کفر کا ساتھ دیں گے۔ پھر اور بھی جس قدر ممبر ہیں سب مسلمان ہی ہیں۔ مولوی وحید حسین صاحب مولوی سید فرید الدین احمد صاحب، مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب، مولوی محمد امانت اللہ صاحب جو جناب مولوی محمد فصیح صاحب کے بیٹے ہیں کیا یہ سب کے سب اور ان کے ساتھ اور تمام مسلمان ممبر ایسے بے ایمان ہو جاویں گے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے تو ہم مجبور ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھ میں خدا ہوتا تو ہم اس کی ضمانت بھی کرا سکتے تھے، مگر لاچاری ہے کہ وہ

ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ جب بہت پوچھا گیا کہ پھر آخر اس کی کوئی راہ بھی ہے جو آپ کی طمانیت ہو، اس وقت انہوں نے یہ فرمایا جو ہمیشہ سے ہم کو مدنظر رہا ہے اور جو ہمیشہ بیان کیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی کوئی کمیٹی علاحدہ ہو، اس کے ممبر علاحدہ ہوں اور وہ ایسے لوگ ہوں جن کو مسلمان عموماً نہایت عمدہ و نیک جانتے ہوں۔ ہم نے کہا تو اس کو مہربانی سے لکھ دیجیے، انہوں نے نہایت نیکی اور مہربانی اور فیاضی سے یہ مضمون ایک کاغذ پر ہم کو لکھ بھیجا، جو ممبر وہاں موجود تھے انہوں نے منظور کیا، جو وہاں موجود نہ تھے ان کو میں نے خط لکھے، جس قدر جواب میرے پاس آچکے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سب ممبروں نے بھی اس کو دل سے پسند کیا اور یقیناً تمام ممبر کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے بغیر کسی استفتاء کے اس کو منظور کرتے ہیں۔ انہوں نے برابر یہ جواب دیا ہے کہ ہمیشہ سے کمیٹی کا یہی ارادہ تھا اور ہمیشہ اس کا شمار بھی ہوتا رہا ہے، کسی شخص کو اس بات کا وہم اور گمان بھی نہیں ہوا کہ مذہبی تعلیم میں کبھی کچھ تبدیلی اور فتور واقع ہوگا۔

شاید ان لوگوں کو میری شامت اعمال کا خیال ہوا۔ میں نہایت گنہ گار سہی، میرے اعمال میرے افعال سب برے سہی۔ میرے لیے کفر کے الحاد کے ارتداد کے فتویٰ لکھو اور مشتہر کرو مجھ کو کچھ شکایت نہیں، لیکن یہ بتلاؤ کہ مدرسہ سے اس کو کیا تعلق ہے، اس وقت کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے چونسٹھ ممبر ہیں کیا، میرے پاس کوئی جادو ہے، کیا ان کے اوپر میرا کچھ زور ہے کہ جو میں کہوں وہ بھی کہنے لگیں جو میں کروں وہ بھی کرنے لگیں گے۔ پوچھو منشی محمد اکرام سے کیا جو میں کہوں گا اور جو میں کروں گا وہی یہ بھی کہنے اور کرنے لگیں گے اور اپنے مذہب کی کچھ پروا نہ کریں گے۔

علاوہ اس کے ایک اور بات بھی غور کرنے کی ہے، یعنی اگر میں برا ہوں تو کیا تم اپنی قوم کو میرے لیے تباہ ہونے دینا پسند کرو گے۔ میں نہایت خوش ہوں کہ میری قوم کا کوئی نیک خواہش کھڑا ہو اور اس سب کام کو انجام دے۔ میں آج ہی علیٰحدہ ہوتا ہوں۔ مگر میں یہ نہیں دیکھ سکتا اور اس کو گوارا نہیں کرسکتا کہ نہ آپ ہی ایک کام کریں نہ مجھ کو ہی کرنے دیں اور اپنی قوم کو مرنے دیں اور ڈوبنے دیں، لیکن اب نہایت شکر کا مقام ہے کہ جو لوگ پہلے ایک وقت میں مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے اب وہ متفق ہیں بلکہ معاون ہیں اور امید ہے کہ اب کوئی شبہہ لوگوں کو باقی نہیں رہا ہے اور اب انشاءاللہ جلد یہ سب آپس کا اختلاف دور ہوا جاتا ہے۔

اب مجھے اپنی تقریر کو مختصر کرنا چاہیے، اس وقت تک ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ کے قریب

مدرسۃ العلوم کے واسطے چندہ ہو چکا ہے، جس میں سے لاکھ روپیہ کے قریب وصول بھی ہوگیا ہے، باقی بھی بتدریج وصول ہوتا جاتا ہے۔ جنہوں نے چندہ دیا ہے ان میں سے اکثروں نے اپنے مقدور اور ہمت سے زیادہ چندہ دیا ہے اور گو میں یہ نہ بھی کہہ سکوں کہ اپنی ہمت سے زیادہ چندہ دیا، لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سب کا سب چندہ یکمشت وصول ہو جاتا، جو رقم انہوں نے چندہ میں لکھی ہے، وہ بہ اقساط ماہواری یا سہ ماہی وصول ہوتی جاتی ہے اور ایک سال یا ڈیڑھ سال یا دو سال میں وہ سب قسطیں وصول ہو جاویں گی۔ ہماری درخواست مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس قدر اس کی ہمت ہو اس قدر چندہ دے۔ اگر کوئی ہماری فہرست چندہ کی دیکھے تو نہایت تعجب کرے گا کہ ایک صفحہ پر ایک ایک شخص سے چالیس ہزار اور دس ہزار پانچ ہزار، ہزار پانچ سو درج ہیں، لیکن دوسرے صفحہ پر پیسہ پیسہ اور دو دو پیسے بھی لکھے ہیں۔ کنجڑوں سے جولاہوں سے مانگنے میں ہم کو شرم نہیں آئی، ہم نے ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی تک بھی جو لوگوں نے اپنی مرضی اور دلی مہربانی سے دیا نہایت شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ لیا۔ نہایت تعریف کے قابل ہے وہ شخص جو یہ سن کر کہ میری قوم ایک کام کے واسطے دس لاکھ روپیہ جمع کرنا چاہتی ہے اپنے ٹوکرہ پر سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر ایک پیسہ دیا یقیناً وہ جانتا تھا کہ میرے ایسے ایک پیسہ سے دس لاکھ روپیہ کا جمع ہونا بہت دشوار ہے، لیکن اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جس کام میں میری قوم کوشش کر رہی ہے میں بھی شامل ہو جاؤں۔ اس نے وہ پیسہ دے کر اپنے دل کو خوش کیا۔ بے شک ہزاروں اور سیکڑوں کی رقمیں جو اکثر چندہ میں وصول ہوتی ہیں اس ایک پیسہ سے بہت بڑی ہیں، لیکن میرے نزدیک وہ ایک پیسہ جو سچی ہمدردی کے ساتھ دیا گیا ان ہزاروں اور سیکڑوں کی رقم سے کچھ کم قدر کے قابل نہیں۔

چندہ جو وصول کیا گیا ہے اس میں سے جس چندہ دینے والے نے کوئی قید، کوئی شرط نہیں لگائی اس کی بابت کمیٹی کو اختیار ہے چاہے جائداد خرید کرے، چاہے پرامیسری نوٹ لیوے۔ اس کے محاصل پر بھی کمیٹی کو اختیار ہے کہ خواہ تعلیم دنیاوی میں لگاوے، خواہ تعلیم مذہبی میں۔ لیکن جو لوگ یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ ان کے روپیہ سے پرامیسری نوٹ نہ خرید کیے جاویں، ان کا روپیہ ان نوٹوں کی خریداری میں صرف نہیں کیا جاتا۔ وہ روپیہ ویسے ہی امانت رکھا جاتا ہے اور اس سے جائداد ہی خریدی جاوے گی اور اس کی آمدنی مدرسے کے کاروبار میں صرف ہوگی۔ علاوہ اس کے چندہ دینے والوں کو یہ بھی

اختیار ہے کہ اپنے چندہ کو کسی کام کے لیے خاص کر دیں، مثلاً جو لوگ اس شرط سے چندہ دیتے ہیں کہ ہمارے روپیہ کی آمدنی خاص دنیاوی علوم کی تعلیم میں صرف کی جاوے، وہ اسی غرض کے واسطے صرف ہوگی اور اس کا حساب جداگانہ رہے گا۔ اسی طرح مذہبی تعلیم کی مد جدا ہے، جنھوں نے مذہبی تعلیم کے لیے چندہ دیا ہے وہ اسی کام کے واسطے جمع ہوا ہے اور اس کی آمدنی اسی میں صرف ہوگی۔ پھر اس میں بھی دو مدیں ہیں۔ ایک اہل سنت و جماعت کی تعلیم مذہبی کی، دوسری مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی تعلیم مذہبی کی اور جو روپیہ جس مد کے متعلق آیا ہے وہ اسی میں جمع ہوا ہے۔ اسی طرح اور بھی دو کام ہیں ایک تعمیر مدرسۃ العلوم کی، دوسرے دو مسجدوں کی تعمیر ایک سنیوں کے لیے دوسری شیعوں کے لیے۔ بعض نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لیے جدا چندہ دیا ہے، وہ جدا جمع ہے۔ مسجدوں کی تعمیر کا چندہ جدا جمع ہوگا۔ جناب عالی نواب صاحب بہادر والی رام پور دام اقبالہم نے علاوہ اپنے پانچ ہزار چندہ کے سابق کے دس ہزار روپیہ مدرسہ کی تعمیر کے واسطے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جس دن مدرسہ کی بنیاد رکھنے کا دن ہوگا اس دن بحضور ویسرائے نواب گورنر جنرل بہادر کو بلایا جاوے گا۔ ان اخراجات کا تخمینہ پانچ ہزار ہے، وہ بھی جناب نواب صاحب ممدوح دام اقبالہم نے علیحدہ منظور فرمایا ہے۔

اب میں تمام رئیسوں سے جو اس وقت موجود ہیں یا موجود نہیں ہیں یہ التماس کرتا ہوں کہ اگر یہ سب باتیں جو میں نے بیان کیں آپ کے نزدیک بھی صحیح ہوں تو آپ سب صاحب بھی خالصۃً للہ اپنی قوم کی بھلائی میں شریک ہوں اور جس کو جو مقدور ہو وہ چندہ دے"۔

(اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، ۲۱/ اگست ۱۸۷۴ء ص ۵۳۰-۵۳۶)

ادبیات

نالۂ فراق

(پروفیسر ریاض الرحمٰن کے سانحۂ ارتحال کے غم میں)

☆جناب وارث ریاضی

قصر حبیب(۱) کا وہ نگہباں چلا گیا
وہ پاسبانِ دانش و عرفاں چلا گیا

وہ ناقد و ادیب، مصنف، رئیس علم
شہر خرد سے شہر خموشاں چلا گیا

وہ حضرتِ عُبید(۲) کا فرزندِ باکمال
دنیائے رنج و غم سے گریزاں چلا گیا

وہ قدردانِ سیّد(۳) و شبلی(۴) نہیں رہا
علم و عمل کا نیّرِ تاباں چلا گیا

افکار بوالکلام(۵) کا وہ شارح جمیل
فکر و نظر کا ماہِ درخشاں چلا گیا

آتی ہے آج سالک(۶) و مہر(۷) وظفر(۸) کی یاد
وہ نازشِ صحافتِ دوراں چلا گیا

تھی جس کے دم سے بزم علی گڑھ کی آب و تاب
وہ آب روے محفلِ یاراں چلا گیا

وہ آشنائے حکمتِ شعر و ادب نہیں
وہ صاحبِ قلم وہ سخن داں چلا گیا

وہ پاس دارِ مہرِ اخوت، انیس قوم
وہ ترجمانِ عظمتِ انساں چلا گیا

☆ کاشانۂ ادب، سکٹا (دیوراج) پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن (بہار) ۸۴۵۴۵۳۔

وہ پیکرِ خلوص و وفا، صاحبِ وقار
روشن صفات مردِ مسلماں چلا گیا
وہ ''فکرِنو'' کا بانی و بالغ نظر مدیر
دنیائے پُرفریب سے نالاں چلا گیا
سن دو ہزار بیس سے کم ایک میں ریاضؔ
۲۰۱۹ء
سوئے جناں بہ مرضیِ رحماں چلا گیا

قطعۂ تاریخ وفات

(پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی)

☆ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

حسبِ حکمِ خدا زِکار افتاد
حرف و صوتِ ریاضِ شروانی
چوں رسیدہ بہ گوشِ ہوشِ رئیس
ذکرِ موتِ ریاضِ شروانی
عددِ ''مہ'' نمودہ کم، فی الفور
۴۵
گفت: فوتِ ریاضِ شروانی

۲۰۶۴
۴۵ -
۲۰۱۹ء

۱۴۴۱ھ

---

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانیؒ۔(۲) مولانا عبید الرحمٰن شروانیؒ۔(۳) سرسید احمد خاںؒ۔(۴) علامہ شبلی نعمانیؒ۔

(۵) مولانا ابوالکلام آزادؒ۔(۶) مولانا عبدالمجید سالکؒ۔(۷) مولانا غلام رسول مہرؒ۔(۸) مولانا ظفر علی خاںؒ۔

☆نعمان منزل، H. N.-4/704، J-24، نیر ابو ہریرہ مسجد، ہمدرد نگر-بی (جمال پور) علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

تذکرۂ شورش از غلام حسین شورش، مرتب ڈاکٹر محمود الٰہی، مترجم ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۴۰۵، قیمت ۱۹۸ روپے، پتہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، ایف۔سی ۹/۳۳، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی ۲۵ /اور ویسٹ بلاک۔۸، آر۔کے پورم، نئی دہلی۔

ہندوستان میں اٹھارویں صدی کے وسط کا زمانہ تھا اور یہ تاریخ میں گویا طوائف الملوکی کا دور تھا، سیاسی لحاظ سے جو بھی تاویل کی جائے مگر اردو زبان کے لیے یہ عہد ترقی و عروج کی منزلوں کو پانے اور اس راہ میں ہر نقش کو لازوال کر دینے کا بھی کہا جاسکتا ہے، تذکرۂ شورش کو اسی خیال کی تائید میں ایک دستاویزی شہادت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، تذکروں سے شغف اور ان کو تاریخی مصادر بنانے کا عمل علوم اسلامیہ میں غالباً سب سے نمایاں ہے، اردو کا عنفوان شباب اس سے محروم کیوں رہتا، میر و گردیزی کے تذکروں نے آئندہ کی راہ ہموار کردی تھی، ایسے میں عظیم آباد پٹنہ میں نصرت شاہ رکن الدین عشق کے مرید و مسترشد غلام حسین شورش کے دل کو مرشد کا یہ قول لگ گیا کہ لوگ تنکے کو پہاڑ اور پہاڑ کو تنکہ بنا کر پیش کرتے ہیں، تذکروں میں شاعر کے مرتبہ کے مطابق اشعار لکھتے نہیں، اس لیے یہ کام شورش کیوں نہ کریں، بقول شورش یہ حضرت کا حکم عالی تھا جو مرید کے لیے سعادت دارین کا سبب بھی تھا، لیکن اس کے علاوہ بھی ایک اور وجہ تھی کہ عظیم آباد سے باہر تو کئی تذکرے لکھے گئے، یہاں نہ فارسی شعرا کا تذکرہ لکھا گیا نہ اردو کا جس کو شورش ہندی سے تعبیر کرتے ہیں، یہ دو خاص وجہیں تھیں اور مقصد صرف ایک تھا کہ عظیم آباد کے شعرا کا خاص طور پر اور باقی شاعروں کا عمومی انداز میں ایسا تذکرہ آجائے جو اہل دل کے کان تک پہنچے اور دل خوش کردے، نیت و مقصد نے جب عملی شکل اختیار کی تو یہ رموز الشعرا کے نام سے متعارف ہوئی، سیکڑوں اردو شاعروں کے اس تذکرے کی زبان فارسی ہی رہی، عجیب بات یہ ہے کہ کئی اولیات و خصوصیات کے باوجود یہ قیمتی نسخہ گمنام ہی رہا، وقت نے کروٹ لی تو دو نسخے سامنے آئے، خانقاہ رشیدیہ جونپور کا نسخہ زیادہ بہتر و مستند نظر آیا تو اس کو پروفیسر محمود الٰہی مرحوم نے مرتب کر کے شائع کردیا، زیر نظر کتاب کو اردو قالب فاضل مترجم ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی نے عطا کیا، فاضل مترجم اور ان کی دوسری بیش قیمت تالیفات اور ترجموں سے قارئین معارف بخوبی متعارف ہیں، فارسی

سے اردو زبان میں منتقل کرتے ہوئے زبان کی سلاست و روانی کو قائم رکھنے میں فاضل مترجم کو خاص مہارت حاصل ہے، یہ کتاب بھی اسی سلیقہ اور شان کی ہے، شورش نے خود کو مستور الحال رکھا، کتاب میں اپنے اشعار تو خوب دیے لیکن اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا، لیکن یہ کمی فاضل مترجم نے جس خوبی سے مقدمہ میں پوری کی وہ یقیناً ان کی وسعت نظر اور صحیح معنوں میں تحقیقی بصیرت کا اظہار ہے، کتاب کے ہر پہلو پر مقدمہ میں روشنی ڈالنے کا حق جس طرح ادا کیا گیا اور اس کے لیے دل سے بے ساختہ صدائے آفریں نکلتی ہے، البتہ اصل نسخہ کے مرتب ڈاکٹر محمود الٰہی کا تعارف اور ان کی کاوشوں کی ایک جھلک مختصر ہی سہی، آ جاتی تو اچھا ہی ہوتا، باقی اصل تذکرہ کی خوبیاں، مضامین غزل اور اس زمانہ کی تصویر کشی بجائے خود ایک تاریخی ماخذ بھی ہے، ۱۷۰۰ اور مابعد کا کیا رنگ تھا، بادشاہ وقت شاہ عالم سے یقینؔ کے اس شعر تک کہ:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند　　برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا

اس وقت کی معاشرت کا وہ آئینہ ہے جس سے بعد کے ہندوستان کی تصویر بڑی آسانی سے بنائی جا سکتی ہے، افسوس اس نہایت اہم کتاب پر تبصرہ کی نوبت اسی طرح برسوں بعد آئی جس طرح دو صدیوں بعد اس کی دریافت ہوئی۔

عالم اسلام پر مغرب کا تسلط ۔ اسباب و نتائج از مولانا محمد واثق ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۲۰، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور لکھنؤ کے تمام مشہور مکتبے۔

یورپ اور عالم اسلام کے موضوع پر ہر قسم کی تحریریں ہیں اور گویا بے شمار ہیں، بہت پہلے دانش افرنگ کا جلوہ دیکھنے والے دیدہ ور نے جب مغرب کی جمہوریت کا تعارف کرایا تھا تو ظاہری روشن چہرہ کے اندرون اس تاریکی کو بھی دکھانے کی کوشش کی تھی جو باطن چنگیز سے تاریک تر ہے، حقیقت یہی ہے کہ تب سے آج تک مغرب نے انسان اور اس کی زندگی کے بارے میں جن تصورات کی عملی تصویر پیش کی ہے، مرعوب ذہن اس سے لاکھ متاثر ہوں لیکن معاملہ وہی تاریک تر والا ہے، دوسری ایشیائی قوموں کی عقلوں پر جو گہن لگا وہ ان کو کتنا سیاہ کر گیا اس سوال سے قطع نظر عالم اسلام پر مغرب کے تسلط نے جو قیامتیں ڈھائیں وہ ملت کے فکر مند ذہنوں کو مسلسل اسباب و نتائج پر غور کرنے کے لیے آمادہ کرتی رہیں، اس کتاب میں یہی کوشش ہے کہ مغرب کی اسلام دشمنی کے عوامل، پس منظر، عیسائی مشنریز، استشراق، صیہونیت،

ماسونیت،کلیسا،سامراج،مادہ پرستی،زر پرستی،سرمایہ داری کا جائزہ لے کر اس کی اصل تصویر پیش کی جائے اور ایسی تہذیب کے موثر ہونے کی تدبیر کی جائے جس سے صالح معاشرہ کی تشکیل ہوسکے،اس لحاظ سے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ ایک دستاویز ہے لائق مصنف کے استاذ مولانا واضح رشید ندوی مرحوم نے اپنی فکر کو جس طرح عام کیا،لائق شاگرد نے اس سے واقعی فائدہ اٹھایا،فکر کے ساتھ پیشکش میں بھی استاذ مرحوم کا رنگ صاف جھلکتا ہے،مولانا سید رابع ندوی کا یہ قول کتاب کو معتبر بنادیتا ہے کہ وقت کی ضرورت کے پیش نظر یہ کوشش بہت لائق قدر ہے،کتاب میں نافعیت ہے اس لیے اس کو عام ہونا ہی چاہیے۔

تذکرہ مورخین از چودھری نبی احمد سندیلوی،مرتب جناب ضیاء فاروقی،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ و طباعت،مجلد،صفحات ۱۸۰،قیمت ۹۶ روپے،پتہ:ایم۔ایچ۔کے،آئی۔ٹی۔سی،رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال-۱،دانش محل،امین آباد،لکھنؤ۔

تذکرہ شعرا کے بعد تذکرہ مورخین بھی سامنے آگئی،۱۹۳۶ء میں چودھری نبی احمد سندیلوی نے یہ کتاب اس مقصد سے لکھی تھی کہ پرانی تاریخوں کو گمنامی سے بچایا جائے،اس کے لیے انہوں نے چاچ نامہ سے تاریخ احمد شاہی اور وقائع جنگ مرہٹہ تک قریب ۱۶۶ رکتب تاریخ کا تعارف کرادیا،ان میں ہندوستان کے مسلمان اور ہندو مورخین کے حالات بھی ہیں اور ان کی کتابوں کا تعارف،درایت اور تحقیق کے ساتھ ہے،اختصار کے بعد بھی ایسی جامع کتاب مشکل سے ملتی ہے،چودھری صاحب مرحوم ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے یعنی جس وقت علامہ شبلی کی تاریخ نگاری ایک نئے ذہن کی تربیت میں اپنا اثر دکھارہی تھی،سندیلوی مرحوم پر بھی یہی اثر دیکھا جاسکتا ہے،فاضل مرتب نے لکھا بھی کہ سندیلوی مرحوم کے مراسم جن سے تھے ان میں علامہ اقبال اور مولانا سید سلیمان بھی شامل تھے،البتہ یہ جملہ توضیح طلب ہے کہ "دوران قیام علی گڑھ ان کی آخری شامیں سید سلیمان ندوی کی مجلس میں گزرتی تھیں"، بہر حال یہ تو ظاہر ہے کہ ان کو تاریخی مطالعات کا خاص ذوق ودیعت ہوا تھا،مرقع بنارس اور مشاہیر سندیلہ بھی ان کی بڑی وقیع کتابیں ہیں لیکن اس کتاب کی اہمیت وافادیت کچھ اور ہی ہے،فاروقی صاحب علمی دنیا کی جانب سے مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایسی مفید کتاب کی اشاعت جدید کی مبارک کاوش کی،تاریخ ہند کے محققین اور طلبہ کے علاوہ یہ ہر اس شخص کے لیے کارآمد ہے جو ہندوستان کو ہندوستانیوں کی نظر سے دیکھے جانے کو غیروں پر ترجیح دیتا ہے۔

شعر زمین از پروفیسر خالد محمود،متوسط تقطیع،عمدہ کاغذ وطباعت،مجلد مع گرد پوش،صفحات ۱۴۶،قیمت

۳۰۰ روپے، پتہ: بی-۲۰، پاکٹ ۹-اے، ڈی ڈی اے فلیٹ، جسولا وہار، نئی دہلی -۳۵، اور جامعہ لمٹیڈ کے تمام مکتبے۔

ایک معلم، استاد، ادیب، نقاد اور محقق کی حیثیت سے اعتبار اور شہرت کی دولت ہی کیا کم تھی کہ اضافہ شاعری کا بھی ہوگیا، لوگ اسے بھوپال اور جامعہ کا اثر کہیں گے لیکن راز کی بات یہی ہے کہ ان نعمتوں کی ارزانی میں سرزمین سرونج کی صفت فراوانی بھی شامل ہے، ریاض المدارس کا چھوٹا سا مکتب ان کے لیے ریاض الجنۃ کا مبشر بن گیا، جہاں قلب ونظر اور زندگی کے نشیب وفراز کے معاملات و واردات سچائیوں کے رنگ میں رنگ گئے، سرونج جس طرح جغرافیائی لحاظ سے کئی انفرادی امتیازات کے لیے جانا جاتا ہے، اسی طرح ادب نوازی میں بھی اس کا الگ انداز ہے اور خالد محمود صاحب اس کی نمائندگی میں پورے بانکپن سے آگے آگے نظر آتے ہیں، ان کا ایک اور شعری مجموعہ سمندر آشنا برسوں پہلے آیا تھا، ہم اس سے آشنا نہیں لیکن اب زیر نظر ایک اور مجموعہ "شعر زمین" کے متعلق وہی سب کہا جاسکتا ہے جو پہلے کہا گیا تھا کہ بیک وقت کلاسکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت سارے عناصر بیک مکان موجود، نعت سبھی کہتے ہیں لیکن احساس کی ایسی ندرت سب کے پاس نہیں کہ:

نہ ذوق لندن و پیرس نہ شوق امریکہ مرے جنوں کو مدینہ پسند رہتا ہے

غزل میں تو قدم قدم پر جدت کی روشیں سامنے آتی جاتی ہیں:

ہزاروں فلسفی قبضہ کیے بیٹھے ہیں ذہنوں پر مرے قابو میں یارب میرا اسراب تک نہیں آیا

کہیں روایات کا یہ احساس کہ:

نہ اب گھر میں وہ تہذیبی توازن نہ اب وہ کوٹھری جنات والی

تو اسی تسلسل میں ظرافت کی یہ شگفتگی:

جسے دیکھو چھپا پھرتا ہے خالد جماعت آگئی میوات والی

مقطع میں سخن گسترانہ بات کا لطف لیجیے، خصوصاً آج کے حالات میں:

امیر شہر تنوع پسند ہے خالد لباس نو کے مطابق زباں بدلتا ہے

کچھ نظمیں بھی ہیں، معلم اور چھ دسمبر کون ہے جو بار بار پڑھنا اور سننا نہ چاہے گا، کتاب میں چند تصویریں بھی ہیں جو نہ بھی ہوتیں تب بھی شعر زمین کی آسمانیت پر اثر نہ پڑتا۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

اجالے ان کی یادوں کے......: مولف محمد مہدی محتشم جامعی، طلبائے بھٹکل، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

اسلام اور عورت: مصنفہ ڈاکٹر نعیم النساء، ایویروز اکیڈمی، علی گڈھ۔ قیمت ۲۵۰/روپے

الخطب الدینیۃ المنبریۃ: ڈاکٹر فرمان ندوی، جمع و ترتیب عبدالحنان ندوی، مکتبہ الشباب العلمیہ، لکھنؤ۔ قیمت درج نہیں۔

دین و شریعت: مولانا محمد منظور نعمانیؒ، الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۲۵۰/روپے

ذکر غزالی: مرتب محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی، دارالکتاب دودھ پور، علی گڑھ۔ قیمت ۴۰۰/روپے

شگفتہ خاطر (مجموعہ کلام): سید حسن عسکری طارق، طلحہ نعمت ندوی، استھانواں، بہار شریف، نالندہ، بہار۔ قیمت ۱۸۰/روپے

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ: مرتب محمود حسن حسنی ندوی، مکتبہ اسلام، رؤف مارکیٹ، گوئن روڈ، امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۴۵۰/روپے

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی علمی و ادبی خدمات: مرتب طلحہ نعمت ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی، استھانواں، بہار شریف۔ قیمت درج نہیں۔

فکر و احساس کی قندیلیں (مقالات و تبصرے): نظیف الرحمٰن سنبھلی، دانش محل، امین آباد، لکھنؤ۔ قیمت ۱۵۱/روپے

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ حیات و خدمات ماہ و سال کے آئینہ میں: تالیف و ترتیب احمد ابوسعید، اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔ ہدیہ ۵۰۰/روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول ودوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم ومصر وشام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
January 2020 Vol - 205 (1)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)